مہوش افتخار

مہوش افتخار

سنگ پارس

کبھی سنی ہے آپ نے ایسی کوئی آواز' ایسا کوئی لہجہ' جو سننے والے کے لیے بیک وقت مژدہ جاں فزا بھی ہو اور جاں ستاں بھی جسے سننے کے لیے سماعتوں نے تو چپکے چپکے ہر آن دعا کی ہو' لیکن جسے کبھی نہ سننے کی استدعا دل نے ہر لحہ کی ہو۔

ایسے میں اگر ایک روز قسمت اچانک ہی سماعتوں پہ مہربان ہونے کی ٹھان لے تو دل حماں نصیب پہ کیا گزرے گی؟ یقیناً" وہی جو اس وقت اس کے دل پہ

ناولٹ

گزر گئی تھی۔ بے یقینی کے اولین جھٹکے کے بعد وہ اپنی نظروں کو اٹھنے سے روک نہ پائی تھی۔ بارش کی چادر کے اس پار' وہ چند فرلانگ کے فاصلے پہ اس کے گمان کو یقین میں بدلنے کے لیے' گاڑی کا دروازہ کھولے کھڑا تھا۔ اسے یوں اچانک اپنے سامنے پا کے طوبیٰ کی آنکھیں مارے حیرت کے پھیل گئی تھیں۔

"نوفل۔ نوفل جاہ!" اس کا ساکت دل تیزی سے ڈوب کر ابھرا تھا۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے مقابل نے سرعت۔ سے دروازہ بند کیا تھا۔ اور اس کی جانب قدم بڑھائے تھے۔ اسے اپنی طرف آتا دیکھ کے طوبیٰ کا پورا وجود کانپ اٹھا تھا۔ اس نے گھبرا کے اپنا بھیگا دوپٹا پیشانی تک کھینچا تھا اور پنجوں کے بل' زمین پہ بکھرے ہوئے سامان کی جانب چہرہ جھکا کے بیٹھ گئی تھی۔ طوبیٰ کو اپنا دل کانوں میں دھڑکتا سنائی دے رہا تھا' مگر اس کے باوجود

وہ نوفل جاہ کے قدموں کی دھمک با آسانی محسوس کر سکتی تھی۔ وہ چلتا ہوا اس کے مقابل آکھڑا ہوا تھا اور طوبیٰ حسن کو لگا تھا جیسے وقت کی گردش تھم سی گئی ہو۔

"ایکسکیوزمی۔ میں آپ سے پوچھ رہا ہوں۔ آپ ٹھیک تو ہیں؟ کوئی چوٹ تو نہیں لگی؟" اس کی جھکی نظروں سے سامنے دو چمکتے ہوئے مردانہ جوتے آٹھہرے تھے۔ لرزتے لبوں کو دانتوں تلے دبائے اس نے دھیرے سے اپنے سر کو نفی میں ہلا دیا تھا۔ تیز ہوتی بارش کے پیش نظر آنے والے نے بھی اس کے اتنے ہی جواب کو غنیمت جانا تھا۔ وہ فوراً" پلٹا تھا اور ایک طرف کو گری اس کی ٹرالی کو سیدھا کرتے ہوئے زمین پہ بکھرا سامان اٹھا اٹھا کر اس میں رکھنے لگا تھا۔

"یا اللہ! یہ۔ یہ کہاں سے آگئے؟" اس کی طرف سے رخ موڑے طوبیٰ آہستگی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے پورے وجود میں سنسناہٹ سی ہونے لگی تھی۔ کاش کہ محض باون منٹ پہلے تک اسے خود پہ ٹوٹ پڑنے والی اس افتاد کا ایک فیصد بھی علم ہو جاتا تو وہ کبھی مر کے بھی بازار کا رخ نہ کرتی۔ اس نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا کہ معمول کی طرح طلوع ہونے والا دن اپنے دامن میں اس کے لیے نوفل جاہ سے ہونے والا ٹکراؤ لیے ہوئے تھا۔ وہ ٹکراؤ جس کی دور تک اب نہ کوئی امید تھی اور نہ ضرورت۔ یہ چہرہ اس کی زندگی سے ہی نہیں بلکہ اس کے شہر سے بھی ایک نہیں' دو نہیں بلکہ پورے دس سال پہلے کوچ کر

گیا تھا۔ ایسے میں سرراہ اس ٹکراؤ کا خیال بھلا کسے آسکتا تھا؟ لیکن اب جبکہ یہ حادثہ وقوع پذیر ہو چکا تھا تو اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس کی نظروں میں آنے سے پہلے پہلے خود کو کہیں غائب کردے۔ یوں کہ نوفل جاہ کو پتا بھی نہ چلے اور طوبیٰ حسن کا وجود ہوا میں کہیں تحلیل ہو جائے۔

"بے وقوف لڑکی! یہ کوئی حرکت تھی کرنے والی؟"

معاً" اس کی پشت پہ ابھرنے والی غصے میں ڈوبی تیز نسوانی آواز نے طوبیٰ کے بھٹکتے خیالات کو منجمد کردیا تھا۔ تو کیا نوفل جاہ کے ساتھ کوئی اور بھی موجود تھا؟ اہانت کے احساس سے طوبیٰ کا چہرہ بری طرح جل اٹھا تھا۔ بے اختیار اس کی نظروں کے سامنے چند لمحے پیشتر پیش آنے والی مضحکہ خیز صورت حال گھوم گئی تھی۔

وہ اپنی یونیورسٹی سے ایک اہم کانفرنس اٹینڈ کر کے گھر واپس جارہی تھی۔ جب راستے میں اچانک اسے اپنی سہیلی رجا کی منگنی کا خیال آگیا تھا، جس میں ایک دن بھی باقی نہ بچا تھا اور وہ تاحال اس کے لیے کوئی تحفہ نہیں خرید پائی تھی۔ مجبوراً" اسے گاڑی کا رخ قریبی سپر مارکیٹ کی طرف موڑنا پڑا تھا، حالانکہ موسم کے تیور ٹھیک ٹھاک خراب ہو چکے تھے۔ مگر چونکہ وہ مجبور تھی اس لیے گاڑی پارک کر کے اندر چلی آئی تھی۔ جہاں گفٹ کے علاوہ اس نے لگے ہاتھوں ضرورت کی اور بھی بہت سی چیزیں خرید لی تھیں۔ یوں پونے گھنٹے بعد جب وہ باہر نکلی تھی تو نا صرف اس کی ٹرالی ٹھیک ٹھاک لد چکی تھی۔ بلکہ ہلکی پھلکی برسنے والی پھوار بھی تیز رفتار بارش میں تبدیل ہو چکی تھی۔

اپنے نئے سوٹ اور شوز کی بربادی پہ جلتی کلستی وہ پوری احتیاط سے آگے بڑھی تھی۔ جب اچانک پارکنگ کے وسط میں پہنچ کر اس کا دایاں پاؤں بری طرح پھسل گیا تھا۔ گھبرا کر اپنا توازن برقرار رکھنے کی کوشش میں اس نے پاس کھڑی گاڑی کا سہارا لیا تھا۔ مگر اس کی ٹرالی اس زوردار جھٹکے کو سہہ نہ پائی تھی۔ وہ آگے کو پھسلی تھی اور پھسلتی چلی گئی تھی۔ شومئی قسمت اسی وقت پارکنگ میں ایک گاڑی نے ٹرن لیا تھا۔ اس اچانک آپڑنے والی افتاد نے گاڑی کے ڈرائیور کو بھی بوکھلا دیا تھا۔ اس نے سرعت سے گاڑی کا رخ موڑا تھا۔ ادھر متوحش سی طوبیٰ بھی ٹرالی کے پیچھے لپکی تھی، مگر اس کے پکڑنے اور قابو کرنے کے چکر میں وزنی ٹرالی ایک طرف کو جھکتی چلی گئی تھی، اور اس کے دیکھتے ہی دیکھتے سارا سامان بمع اس منحوس ٹرالی کے زمین بوس ہو گیا تھا۔

جھنجلائی ہوئی طوبیٰ چیزوں کو اٹھانے کے لیے نیچے کو جھکی تھی اور تب ہی برستی بارش کے شور میں دور سے ایک آواز آئی تھی۔

"آر یو آل رائٹ؟" اور طوبیٰ حسن کو لگا تھا جیسے اس کا پورا وجود پتھر کا ہو گیا ہو۔ یہ آواز تو وہ نیند میں بھی پہچان سکتی تھی۔ تیز ہوتی دھڑکنوں کے ساتھ اس نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا تھا اور نوفل جاہ کو دور کھڑی گاڑی کے پاس استادہ دیکھ کر وہ پلکیں جھپکنا بھول گئی تھی۔

اسے اپنی طرف بڑھتا دیکھ کے طوبیٰ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ وہ بری طرح سٹپٹا گئی تھی۔ لیکن اب جو اسے اپنے اردگرد ایک تیسرے وجود کا احساس ہوا تھا۔ تو یہ ساری صورت حال اس کے لیے مزید تکلیف دہ اور شرمندگی کا باعث بن گئی تھی۔

کیا یہ ضروری تھا کہ دس سال بعد نوفل جاہ سے اس کا سامنا ایسی حالت میں ہوتا۔ جہاں وہ کم عقلی اور لاپروائی کی عملی تصویر بنی کھڑی تھی؟ یوں جیسے وہ آج بھی ایک نادان لڑکی ہو۔ اپنی حالت زار اسے ملال میں مبتلا کر گئی تھی۔

"محترمہ! میں تم سے مخاطب ہوں؟" اس کی خاموشی مقابل کے غصے کو مزید ہوا دے گئی تھی۔ اس نے ایک تیز نظر بت بنی طوبیٰ کی پشت پہ ڈالی تھی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتی اس کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔ طوبیٰ کی نظریں اس کے چہرے سے ٹکرائی تھیں اور پھر گویا پلٹنا بھول گئی تھیں۔

گلابیاں چھلکاتی بے داغ سفید رنگ پہ ہرنی سی آنکھیں لیے وہ جو کوئی بھی تھی۔ قدرت کی صناعی کا

شاہکار تھی۔ وہ اس پل تصور کی آنکھ سے اپنے ظاہری حلیے کی ابتری کا اندازہ بھی باخوبی لگا سکتی تھی۔ اس کا نیا قیمتی جوڑا بارش میں بھیگ کر اچھا خاصا برباد ہو چکا تھا۔ ٹراوزر اور دوپٹے پہ پڑنے والی گندے پانی کی چھینٹیں اور بالوں سے ٹپکتا پانی' اس کی شخصیت کا سارا رکھ رکھاؤ اپنے ساتھ بہالے گیا تھا۔ وہ اس پل یقیناً" اس کے سامنے' بہت عام' بہت معمولی سی لگ رہی تھی۔

وہ اس سے نجانے کیا کیا کہہ رہی تھی' طوبیٰ کو تو صرف اس کے لپ اسٹک سے سجے ہونٹ ہلتے ہوئے نظر آرہے تھے۔

"حد ہوتی ہے۔ تم پہ تو کوئی اثر ہی نہیں ہو رہا!" اس کا گم سم سا انداز لڑکی کو زچ کر گیا تھا۔ وہ ایک کھا جانے والی نظر طوبیٰ پہ ڈالتی نوفل کی جانب بڑھی تھی۔ اس کے سامنے سے ہٹتے ہی طوبیٰ بھی خود میں لوٹ آگئی تھی۔

"کوئی ضرورت نہیں اس بدتمیز لڑکی کی ہیلپ کرنے کی نوفی۔ یہ اس کرٹسی (ہمدردی) کے لائق نہیں۔" اور پتا نہیں کیوں لیکن نوفل کے سامنے اس کا یہ تحقیرانہ انداز طوبیٰ کو سرتاپا سلگا گیا تھا۔ آخر وہ کیوں خود کو نوفل جاہ کی نظروں سے چھپانا چاہ رہی تھی؟ کیا لگتا تھا وہ اس کا جو وہ اس کے سامنے اس درجہ اہانت محسوس کر رہی تھی۔ خود کو کھری کھری سناتے وہ ساری احتیاط بالائے طاق رکھ کر غصے سے پلٹی تھی۔

"انف از انف (بہت ہو چکا) میں نے آپ لوگوں سے مدد نہیں مانگی تھی۔ جائیے جا کر اپنا کام کیجیے۔ نوفل جاہ پہ ایک نگاہ غلط ڈالے بنا اس نے ایک جھٹکے سے ٹرالی اپنی جانب کھینچی تو سامنے کھڑا نوفل ساکت رہ گیا۔

"طوبیٰ!" اس کے پکارنے پہ جہاں وہ لڑکی چونکی تھی۔ وہیں طوبیٰ نے ایک تلخ نگاہ اس کے چہرے پہ ڈالی تھی۔ ان ساحر آنکھوں کو اتنے قریب سے دیکھنے کا موقع اسے آج کہیں دس سال بعد جا کر ملا تھا۔ اس کا دل پانی بننے لگا تھا۔ اور اس سے پہلے کہ یہ پانی آنکھوں میں جھلملا کے اس کے بھرم کو تار تار کرتا' وہ اپنے باوقار انداز میں دھیرے سے مسکرادی تھی

"واٹ آ سرپرائز۔ کیسے ہیں آپ؟" اس کا ٹھہرا ہوا انداز نوفل جاہ کو چونکنے پر مجبور کر گیا تھا۔ اس نے ایک گہری نظر طوبیٰ حسن کے چہرے پر ڈالی تھی۔ جو بارش میں بھیگی موم کی کوئی گڑیا لگ رہی تھی۔ اسے یوں ایک دم سے اپنے سامنے پا کے وہ حیران رہ گیا تھا۔ لیکن طوبیٰ کے چہرے پہ کوئی تاثر تو دور' حیرت کی رمق تک نہ ابھری تھی' جو نوفل کے نزدیک خاصا غیر فطری رد عمل تھا۔

"میں ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ...... گھر میں سب کیسے ہیں؟" وہ اپنے مخصوص ٹھہرے ہوئے انداز میں گویا ہوا تو طوبیٰ کی پیاسی سماعتوں پہ پھوار سی برسنے لگی۔

"اللہ کا شکر ہے۔ سب ٹھیک ہیں۔ معذرت چاہتی ہوں' میری وجہ سے آپ کو......"

"اٹس آل رائٹ۔" نوفل جاہ نے اسے ہاتھ اٹھا کر مزید کچھ کہنے سے روک دیا تھا۔ طوبیٰ بے اختیار خاموش ہو گئی تھی۔ ایک لمحے کو نظریں چراتے ہوئے اس نے مروتا" مزید کچھ کہنا چاہا تھا۔ مگر کہنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔

"اللہ حافظ۔" چند سیکنڈ کے تذبذب کے بعد طوبیٰ نے الوداعی کلمات کہتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تھا۔ طوبیٰ نگاہیں چراتی حوصلے سے مسکرائی تھی اور پھر دھیرے سے ٹرالی لیے آگے بڑھ گئی تھی۔ ہر ملال بھول

گیا تھا۔ یاد رہا تھا تو صرف جدائی کا وہ زہر جو ہر اٹھتے قدم کے ساتھ وہ گھونٹ گھونٹ اپنے اندر اتار رہی تھی۔ اس زہر کی تلخی کو برداشت کرنا کل بھی محال تھا اور آج بھی اسے سہنا، کسی عذاب سے کم نہ تھا۔ وہ ضبط کی انتہا پر تھی۔ اس کا دل ہمک ہمک کر ایک بار۔ صرف ایک بار اس کے چہرے کو پلٹ کر دیکھنے کے لیے مچل رہا تھا۔ جو بچپن سے اس کے اندر سانس لے رہا تھا۔ اور جسے دوبارہ کبھی دیکھنا جانے اسے نصیب ہونا بھی تھا یا نہیں۔

مگر طوبیٰ حسن پتھر کی نہیں ہونا چاہتی تھی۔ اس لیے چپ چاپ اپنے دل کو کچلتی آگے بڑھتی چلی گئی تھی۔ یہاں تک کہ آنسوؤں کی جھڑی بارش کے پانی کے ساتھ مل کر اس کے چہرے پہ بہنے لگی تھی۔

☆ ☆ ☆

بارش اسے سرتاپا بھگو رہی تھی۔ مگر بھیگنے کا احساس جیسے ختم ہو گیا تھا۔ وہ ایک ٹک دور جاتی طوبیٰ حسن کو دیکھ رہا تھا۔ جو اس کے دیکھتے ہی دیکھتے اپنی گاڑی میں بیٹھی تھی اور اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ کب تک کے لیے؟ وہ نہیں جانتا تھا۔

اس کے منظر سے غائب ہوتے ہی وہ بھی اس حیرت کدے سے باہر نکل آیا تھا، جہاں اس کی اچانک موجودگی نے اسے دھکیل دیا تھا۔ نگاہوں کا زاویہ بدلا تھا تو اسے اپنے دائیں جانب کھڑی نگین بھی نظر آ گئی تھی۔ جو گہری نظروں سے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"ارے تم اب تک یہیں کھڑی ہو؟" اس کے چونک کر کہنے پہ نگین نے اپنی بھنویں اچکائیں تو وہ اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "آئی مین بھیگنے کے بجائے گاڑی میں چل کر بیٹھتی نا۔"

"تم بھی تو بھیگ گئے ہو۔" اس کا جتاتا ہوا انداز نوفل جاہ کو ایک پل کے لیے خاموش کروا گیا۔

"ہاں۔ ہم دونوں ہی بھیگ گئے ہیں۔" بے تاثر لہجے میں کہتا وہ پلٹ کر اپنی گاڑی کی طرف چل دیا۔ تو نگین کی صبیح پیشانی پہ بل نمودار ہو گئے۔ نوفل کا یہ انداز اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے برابر گاڑی میں بیٹھتے ہوئے نگین نے ایک کھوجتی نظر نوفل جاہ پہ ڈالی تھی جو ٹشو سے اپنا چہرہ خشک کر رہا تھا۔

"کون تھی یہ؟" اس نے اپنا لہجہ نارمل رکھنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔

"ہمارے پرانے فیملی فرینڈز کی بیٹی تھی۔" نوفل نے اس کی طرف دیکھے بنا اپنا کام جاری رکھا تھا۔

"وہ صرف فیملی فرینڈز ہی تھے نا؟" نگین نے طنزیہ نظروں سے اسے دیکھا تو نوفل کا ہاتھ یک لخت ساکت ہو گیا۔

"کیا مطلب؟" وہ سپاٹ چہرہ لیے اس کی طرف پلٹا تو وہ ایک جتاتی نگاہ اس پر ڈال کر جانب اچھالتی ونڈ اسکرین کے پار دیکھنے لگی۔

"میرا مطلب ہے خاصے گم صم سے لگ رہے ہو۔"

اور اس کی بات نوفل جاہ کی پیشانی شکن آلود کر گئی۔ اس نے ایک تیز نظر نگین فاروق کے چہرے پر ڈالی اور لب بھینچے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

وہ جو کوئی بھی تھی ان دونوں کا موڈ بری طرح خراب کر گئی تھی۔ اور یہ بات نگین کے مزاج پہ بے حد گراں گزری تھی۔

☆ ☆ ☆

چوکیدار کے گیٹ کھولنے پہ طوبیٰ نے گاڑی آگے بڑھائی تھی۔ لیکن جوں ہی اس کی نظر پورچ میں ایک طرف کھڑی تائی جان کی گاڑی سے ٹکرائی تھی، وہ بے اختیار سر پکڑ کے رہ گئی تھی۔ اس کی ذہنی کیفیت کم از کم اس وقت ان کی طنزیہ اور تلخ باتوں کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن چونکہ اس کے پاس اندر جانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اس لیے وہ غیاث کو گاڑی میں سے سامان نکالنے کا کہہ کر خود اندر چلی آئی تھی۔ جہاں لاؤنج میں اماں جان اور تائی جان کے ساتھ پھپھو کو بھی بیٹھا دیکھ کر اس کا دل چاہا تھا کہ وہ الٹے قدموں واپس نکل جائے۔

"السلام علیکم۔" مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق وہ مرے مرے قدموں سے آگے بڑھی تھی۔ اس کی آواز پہ تینوں خواتین نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ اور اسے اس برے حلیے میں دیکھ کر بے اختیار چونک گئی تھیں۔

"وعلیکم السلام۔ یہ تم اتنی بھیگ کیسے گئیں بیٹا؟" اماں جان کی آواز میں تشویش آئی تھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی پھپھو کی سپاٹ آواز نے اسے ان کی طرف دیکھنے پہ مجبور کر دیا تھا۔

"کہاں سے آرہی ہو تم؟" اس کے سلام کا جواب دیے بنا وہ سیدھا اپنے مطلب کی بات پہ آئی تھیں۔ طوبیٰ نے بامشکل تمام اپنی ناگواری کو چہرے پہ آنے سے روکا تھا۔

"یونیورسٹی سے۔"

"اس وقت؟" تائی جان نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹاتے ہوئے گھڑی کی طرف دیکھا تھا۔ جہاں شام کے 6 بجنے والے تھے۔ انہوں نے ایک جتاتی نگاہ اس کے چہرے پہ ڈالی تھی۔ جسے طوبیٰ نے حوصلے سے نظرانداز کر دیا تھا۔

"آج یونیورسٹی میں کانفرنس تھی ہماری۔" اس کی بات ابھی مکمل ہی ہوئی تھی کہ پیچھے سے غیاث دروازہ بجا کے لدا پھندا اندر چلا آیا تھا۔ پھپھو اور تائی جان کے ساتھ اب کے اماں جان بھی چونک گئی تھیں۔

"بی بی جی یہ سامان کہاں رکھوں؟" اس نے طوبیٰ کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا تو پھپھو اور تائی جان کی نظریں ایک دوسرے سے آ ٹکرائیں۔

"اماں جان کے کمرے میں رکھ دو۔" ان کی نگاہوں کی معنی خیزی کو نظرانداز کیے وہ تحمل سے بولی۔ تو تائی جان کے لبوں پہ استہزائیہ مسکراہٹ آ ٹھہری۔

"یہ شاپنگ بھی کیا کانفرنس سے کی ہے؟" ان کا چوٹ کرتا انداز طوبیٰ کا خون کھولا گیا تھا۔ مگر اس نے کمال ضبط سے خود کو کوئی تلخ بات کہنے سے روکا تھا۔ بڑوں سے بدتمیزی اس کی تربیت کا حصہ نہ تھی۔

"میں وہاں سے فارغ ہو کے بازار چلی گئی تھی۔"

اس کا جواب اماں جان کو غصہ دلا گیا تھا۔ "یہ کوئی موسم تھا بازار جانے کا؟" انہوں نے ایک تیز نظر اس پہ ڈالتے ہوئے جیٹھانی کی طرف تھا۔

"میں نے ہی اسے فون کر کے کہا تھا بھابھی۔ کچھ ضروری چیزیں لانی تھیں۔" اماں جان کی مداخلت پہ طوبیٰ کی نظریں بے اختیار ماں کے شفیق چہرے پہ جا ٹھہری تھیں۔ جو خود بھی یقیناً "اس بے وقت اور بے موسم کی شاپنگ پہ اس سے ناراض تھیں۔ مگر بظاہر انہوں نے۔ ساری ذمہ داری خود پر لے لی تھی۔

"جاؤ جا کر چینج کرو بیٹا۔" انہوں نے ایک فہمائشی نظر طوبیٰ پہ ڈالتے ہوئے رسان سے کہا تو وہ لمحہ کا توقف کیے بنا آگے بڑھ گئی تھی۔ اپنے پیچھے اسے تائی جان کی آواز سنائی دی تھی۔

"کیسی ماں ہو بھئی۔ یہ کوئی وقت اور موسم تھا اسے بازار بھیجنے کا؟" ان کی اماں جان پہ چڑھائی اس کا دل مزید مکدر کر گئی تھی۔ وہ بوجھل قدموں سے راہداری طے کر کے اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

پرس اور بھیگا دوپٹا اتار کر ایک طرف ڈالتے ہوئے اس نے پیروں کو جوتوں کی قید سے آزاد کیا تھا۔ اور خود نڈھال سی بستر پر گر سی گئی تھی۔ ایک عجیب سی تھکاوٹ اسے اپنے روم روم میں سماتی محسوس ہو رہی تھی۔ یوں جیسے وہ نجانے کتنی لمبی مسافت طے کر کے آئی ہو۔

خلا میں تکتے ہوئے اس کی نظروں کے سامنے ایک بار پھر نوفل جاہ کا چہرہ آٹھہرا تھا۔ وجیہہ تو وہ پہلے ہی تھا۔ لیکن اب تو جیسے ایک تمکنت سی چھلکنے لگی تھی اس کے وجود سے۔ اس جیسے شاندار شخص کے ساتھ وہ حسین مورت ہی جچ سکتی تھی۔ اس لڑکی نے جس استحقاق سے اسے "نوفی" بلایا تھا' وہ طوبیٰ پہ بہت کچھ واضح کرنے کے لیے کافی تھا۔ نوفل جاہ کی پسند بیج میں لاجواب تھی۔ مگر طوبیٰ حسن کے لیے اس کے پہلو میں کسی اور کو دیکھنا ایک جان لیوا احساس تھا۔ وہ اپنے بازو میں منہ چھپائے پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی تھی۔

"آپی!" اچانک دروازہ کھلنے کے ساتھ ماہ نور کی آواز نے اس کی سسکیوں پہ بند باندھ دیا تھا۔ وہ اپنے آنسو صاف کرتی آہستہ سے اٹھ بیٹھی تھی۔ اس کے سرخ چہرے اور بھیگی آنکھوں پہ نگاہ پڑتے ہی اندر آتی ماہ نور بری طرح چونک گئی تھی۔

"آپ رو رہی ہیں؟ کیا ہوا ہے۔" گھبرا کے اس کے قریب آتے ہوئے ماہ نور نے اس کا رخ اپنی جانب موڑنا چاہا تو طوبیٰ کے لیے خود پہ قابو پانا مشکل ہو گیا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے زار و قطار رو پڑی تو ماہ نور نے بے اختیار اسے خود سے لگا لیا اور جی بھر کر اسے رونے دیا۔ چند لمحوں بعد جب طوبیٰ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا تو وہ خود آہستہ سے اس سے الگ ہو گئی تھی۔

"یہ پانی پئیں۔" ماہ نور نے سائیڈ ٹیبل پہ رکھے جگ میں سے پانی کا گلاس بھر کے اس کی طرف بڑھایا تھا جسے اس نے خاموشی سے تھام لیا تھا۔

"اب بتائیں۔ کانفرنس میں کوئی مسئلہ ہوا ہے یا۔۔۔" طوبیٰ نے بے زاری سے اس کی بات کاٹ دی۔

"یہ لوگ ہمارا پیچھا کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟" اور ماہ نور اس کا اشارہ سمجھ کر ایک گہری سانس لے کر رہ گئی تھی۔ "ابھی میں نے قدم رکھا نہیں تھا کہ دونوں شروع ہو گئیں کہاں گئی تھیں؟ کیوں گئی تھیں؟ اتنی دیر؟ دل کر رہا ہے سر پھاڑ لوں اپنا!" طوبیٰ کی آواز پھر سے بھر آئی تھی۔ اس کے دل کا کرب اپنی جگہ تھا' لیکن ان لوگوں نے اسے بیچ میں زچ کر دیا تھا۔

"اچھا آپ ٹینشن کیوں لے رہی ہیں۔ چھوڑیں انہیں۔ ان کا تو کام ہی دوسروں کو تکلیف پہنچانا ہے۔" ماہ نور نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ تو طوبیٰ نے ایک پل کو اپنی آنکھیں بند کرتے ہوئے حواس بحال کیے۔

"کیا چاہتی ہیں اب یہ؟" اس نے آنکھیں کھولتے ہوئے ماہ نور کی طرف دیکھا۔

"وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔ انہیں پاپا کا انکار منظور نہیں۔ تائی جان ہر حال میں یہ رشتہ جوڑنا چاہتی ہیں۔ اسی لیے پھپھو کو ساتھ لے کر آئی ہیں۔"

"ہونہہ اور پھپھو تو ہیں ہی تائی جان کی سگی۔" طوبیٰ نے غصے سے ہنکارا بھرا۔ "انہیں انکار کرکے بھلا انہوں نے اپنی شامت بلوانی ہے؟؟"

پھپھو اور تائی جان ایک دوسرے کی عم زاد ہونے کے ساتھ ساتھ وٹے سٹے میں بیاہی ہوئی بھی تھیں۔ سو تائی جان کی ہاں میں ہاں ملانا **عصمی** پھپھو کی مجبوری تھی۔ مگر پھر جہاں بات اس کی اماں جان اور ان تین بہن بھائیوں کی آجاتی تھی وہاں تو پاپا کا سارا خاندان ہی ایک ہو جاتا تھا کیونکہ طوبیٰ کے والد حسن مجتبیٰ ان سب کے سگے نہیں بلکہ واحد سوتیلے بھائی تھے۔ جنہیں ان کی والدہ مرحومہ نے اپنی یتیم بھتیجی سے بیاہ دیا تھا۔ جو حسن صاحب ہی کی طرح اکلوتی تھیں۔

سوتن کے اس فیصلے نے مجتبیٰ صاحب کی بڑی بیگم کو آگ بگولا کر دیا تھا۔ وہ حسن جیسے شاندار اور پڑھے لکھے لڑکے کا رشتہ اپنی بھانجی سے کرنا چاہتی تھیں تاکہ اس راجدھانی کی بلاشرکت غیرے مالک بن سکیں، مگر جب ایسا نہ ہو سکا تھا تب وہ نا صرف اپنی سوتن سے کھنچ گئی تھیں، بلکہ انہوں نے حسن صاحب کی بیوی ارجمند کو بھی برے طریقے سے رد کر دیا تھا۔ حالات کے تقاضے کو دیکھتے ہوئے مجتبیٰ صاحب نے اپنی زندگی میں ہی اپنی دونوں فیملیز کو الگ کر دیا تھا وہ ایک دولت مند شخص تھے۔ چنانچہ ان کی پانچوں اولادوں کے حصے میں جن میں چار بیٹے اور ایک بیٹی شامل تھی، ٹھیک ٹھاک جائیداد آئی تھی۔

بھائیوں سے علیحدگی کے بعد حسن صاحب نے اپنے ایک دوست کے ساتھ شراکتی بنیاد پہ کاروبار شروع کیا تھا جس میں انہوں نے دن دگنی رات چوگنی ترقی کی تھی۔ وقت تیزی سے آگے گزرا تھا۔ بڑے بوڑھے اور بچے جوان ہو گئے تھے۔ حسن صاحب اب اپنے وسیع کاروبار کے مختار کل تھے۔ دوست کے حصے کے شیئرز اس کے حوالے کرکے وہ شراکت داری ختم کر چکے تھے۔ مگر افسوس کہ ان کے اکلوتے اور بڑے بیٹے احمر کو باپ کے بزنس سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ

پڑھنے کے لیے باہر گیا تھا۔ اور پھر وہیں شادی کرکے سیٹل ہو گیا تھا۔ بیٹے کے اس فیصلے نے حسن صاحب کو شدید دھچکا پہنچایا تھا۔ ان کے نام، مقام ہر چیز کے مستقبل پہ سوالیہ نشان لگ گیا تھا۔ اس خاموش فکر نے انہیں دل کے عارضے میں مبتلا کر دیا تھا، مگر انہوں نے ہمت نہ ہاری تھی۔ وہ اپنی ذمہ داریاں تنہا ہی سنبھالنے لگے تھے۔ اپنے بہن بھائیوں سے بھی انہوں نے ہمیشہ اچھے تعلقات رکھنے کی کوشش کی تھی۔

احمر کی اس بے نیازی نے حسن صاحب کے سوتیلے بھائیوں کو ان کے بزنس اور جائیداد کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔ انہیں اب حسن مجتبیٰ سے دوہرے رشتے جوڑنے میں فائدہ ہی فائدہ نظر آنے لگا تھا۔ لہٰذا ان کے سب سے بڑے بھائی نے سب سے پہلے عقل مندی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے آخری اور بگڑے ہوئے سپوت کے لیے طوبیٰ کا رشتہ مانگ لیا تھا۔ ان کی اس درجہ ہوشیاری اور تیزی پہ ان کے باقی دونوں بھائی بے حد جز بز ہو گئے تھے، مگر چونکہ تیر کمان سے نکل چکا تھا اس لیے سب ہی نے بڑے بھائی کے ساتھ جھوٹی مخلصی دکھانے کو چپ سادھ لی تھی۔ بہن کی حمایت تو تایا جان کو ویسے بھی وٹے سٹے کی وجہ سے حاصل تھی۔ یوں لے دے کے ساری بات حسن صاحب پہ آ گئی تھی جن کی طرف سے انہیں انکار کی امید نہ تھی۔

مگر حسن مجتبیٰ اور ارجمند بیگم دونوں کو ہی ضیا کی عادات واطوار پہ اعتراض تھا۔ وہ باپ کی دولت اور طاقت کے نشے میں چور ایک تند مزاج لڑکا تھا، جس میں اپنے کوئی ذاتی اوصاف نہ تھے۔ حسن صاحب نے بہت شائستگی سے بڑے بھائی سے معذرت کر لی تھی، مگر وہ تو انکار سن کے ہتھے سے اکھڑ گئے تھے۔ انہیں ہر حال میں طوبیٰ کا رشتہ چاہیے تھا۔ ان کی ضد پہ سوائے **عصمی** پھپھو کے سب ہی کی ہمدردیاں حسن مجتبیٰ کے ساتھ ہو گئی تھیں جنہیں اپنی بیٹی کے لیے ایک اچھا اور سلجھا ہوا شریک سفر چننے کا پورا اختیار تھا۔

سب کے سمجھانے بجھانے کے باوجود تایا جان پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھے۔ ان کے مطابق وہ اس خاندان کے

بڑے تھے اور انہیں اپنے بہن بھائیوں کی اولادوں پر پورا حق حاصل تھا۔ ان کی اس تکرار پہ حسن صاحب نے خاموشی اختیار کرلی تھی۔ مگر تایا جان کی فیملی وقتاً" فوقتاً" اپنا مطالبہ لے کر حسن ولا چلی آتی تھی۔ جس پہ ناچاہتے ہوئے بھی ان سب کے ذہن پراگندہ ہوجاتے تھے۔

"اچھا چھوڑیں نا انہیں۔" ماہ نور اس کا ہاتھ تھامے محبت سے بولی تھی۔ "میں آپ کے اور اپنے لیے اچھی سی چائے لاتی ہوں۔ تب تک آپ چینج کرکے فریش ہوجائیں۔" اس کے اصرار پہ طوبیٰ کو اٹھنا پڑا تھا۔ مگر جس وقت وہ کپڑے بدل کر منہ ہاتھ دھوکے واپس آئی تھی اماں جان اس کے کمرے میں موجود تھیں۔ ان کے چہرے پہ چھائی خفگی طوبیٰ کو اپنی متوقع شامت کا پتا دے گئی تھی۔

"مجھے تم سے اس بے وقوفی کی امید نہیں تھی۔ کیا ضرورت تھی اس موسم میں یونیورسٹی کے بعد بازار نکلنے کی؟" انہوں نے ناراضی سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

"رجا کا گفٹ نہیں لیا تھا۔ اس لیے جانا پڑا تھا۔" وہ تحمل سے بولی تو اماں جان ایک لحظہ کو خاموش ہوگئیں۔

"تو صرف گفٹ لیتی نا۔ اتنی لمبی چوڑی خریداری کی اس وقت کیا ضرورت تھی۔" پل کے توقف کے بعد وہ پھر سے بولیں تو طوبیٰ کا صبر جواب دے گیا۔

"کون سا وقت اماں جان؟ چھ بجے میں گھر میں تھی۔ آپ کیوں ان عورتوں کے پیچھے لگ کر خود کو پریشان کررہی ہیں۔ یہ ہماری زندگی ہے ہم جس وقت اور جہاں چاہیں گے جائیں گے۔ ان کی اجازت درکار نہیں ہے ہمیں....." اس کی جھنجلاہٹ ارجمند بیگم کو ایک گہری سانس لینے پر مجبور کرگئی۔

"اچھا یہ بتاؤ کانفرنس کیسی رہی تمہاری؟" انہوں نے قصداً" بات کا رخ موڑا تو طوبیٰ بھی سر جھٹکتی ان کے قریب آبیٹھی۔ اور دن بھر کی روداد سنانے لگی مگر صرف یونیورسٹی کی حد تک۔ اس دوران ماہ نور بھی چائے لے آئی تو تینوں ماں بیٹیاں ہلکی پھلکی باتوں میں مشغول ہوگئیں۔

"آج تمہارے احمد انکل آئے تھے۔" باتوں باتوں میں اماں جان نے دھیرے سے کہا تو طوبیٰ بے اختیار ٹھٹک گئی۔ احمد نجم نا صرف حسن صاحب کے دوست تھے بلکہ ان کے ڈاکٹر بھی تھے۔ وہ شہر کے مایہ ناز ماہر امراض قلب تھے۔

"خیر تو تھی؟"

"تمہارے پاپا کی طرف سے بہت پریشان ہیں وہ۔ سرجری ناگزیر ہوچکی ہے مگر حسن اس بات کو سنجیدگی سے لینے کے لیے تیار ہی نہیں۔" ارجمند بیگم کی آنکھوں میں نمی پھیل گئی تھی۔ طوبیٰ کا دل دھک سے رہ گیا۔

"آپی ہمیں ہر حال میں پاپا کو جلد از جلد اس آپریشن کے لیے قائل کرنا ہوگا۔" ماہ نور نے پریشانی سے اسے دیکھا تو وہ متفکر سی نچلا لب دانتوں تلے دبا گئی۔ کسی نے صحیح کہا ہے "اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔" سو اس کا دھیان بھی پوری طرح سے حسن صاحب کی جانب مبذول ہوگیا تھا۔ جن کے بنا اس کے لیے زندگی کا تصور بھی محال تھا۔

☼ ☼ ☼

رات اپنا تسلط چار سو قائم کرچکی تھی، مگر نوفل جاہ کی آنکھوں پہ رت جگے کا پہرا تھا۔ قسمت بعض اوقات آپ کے ساتھ بہت زیادتی کرجاتی ہے۔ آپ پہلے ہی جن معاملات میں اپنے صبر کی آخری حد کو پہنچے ہوتے ہیں 'یہ ان ہی میں سے آپ کی آزمائش کا سامان کردیتی ہے۔

کیا ضرورت تھی لمحے دو لمحے کے لیے طوبیٰ حسن کو اس کے سامنے لانے کی؟ یوں کہ ابھی آنکھوں کی بے یقینی بھی دور نہ ہوپائی تھی اور وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی۔ وہ طوبیٰ حسن کا چہرہ دیکھ کر پلکیں جھپکنا بھول گیا تھا۔ دس طویل سالوں بعد وہ اس کے سامنے تھی۔ اسے اچانک اپنے روبرو پاکے اس کے دل کی جو حالت ہوئی تھی اسے یاد کرکے رات کے اس

پھر بھی نوفل جاہ کے جسم کا رواں رواں کھڑا ہو گیا تھا۔ بارش کے قطرے اس کے چہرے پر سے یوں پھسل رہے تھے جیسے وہ موم کی بنی ہوئی ہو۔ اس کا پیارا من موہنا سا چہرہ' وقار اور سمجھ داری کے رنگوں سے سج کے اور بھی دلکش اور دلفریب ہو گیا تھا' مگر اس حسین چہرے کے ٹھہرے ہوئے تاثرات نے نوفل جاہ کو ٹھٹکنے پہ مجبور کر دیا تھا۔ وہ اسے اچانک اپنے سامنے پا کے بالکل بھی حیران نہیں ہوئی تھی' یوں جیسے وہ اس کی موجودگی سے پہلے سے آگاہ ہو۔ اس کو دیکھ کر بھی انجان بن جانے کی اس ادا نے نوفل کے دل پر ایک گھونسا سا مارا تھا۔

اس اذیت نے تاحال اس کے سینے کو جکڑ رکھا تھا۔ وہ لب بھینچے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور دھیرے دھیرے چلتا دریچے میں آ کھڑا ہوا تھا۔ رات کے اس پہر دور کہیں کوئی مغنی اپنے خوب صورت سر بکھیر رہا تھا جو ہوا کے دوش پہ اڑتے نوفل کی روح میں اتر گئے تھے۔

تم کو دیکھا تو یہ خیال آیا
زندگی دھوپ تم گھنا سایا.....

اور نوفل جاہ کی آنکھوں کے سامنے چھم سے طوبیٰ حسن کا بھیگا چمکتا ہوا چہرہ آ ٹھہرا تھا۔ اس کے دل میں اک ہوک سی اٹھی تھی۔

آج پھر دل نے اک تمنا کی
آج پھر دل کو ہم نے سمجھایا
زندگی دھوپ تم گھنا سایا.....

"میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں!" اس کی نرم آواز نوفل کے اندر کہیں گونجی تھی۔ یارے ضبط کے اس نے اپنی آنکھیں سختی سے بند کر لی تھیں۔

تم چلے جاؤ گے تو سوچیں گے
ہم نے کیا کھویا ہم نے کیا پایا
زندگی دھوپ تم گھنا سایا.....

بے اختیار نوفل کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں

ہم جسے گنگنا نہیں سکتے
وقت نے ایسا گیت کیوں گایا.....

اور اس کے لیے مزید وہاں کھڑے رہنا ممکن نہ رہا تھا۔ اس نے پیچھے ہٹتے ہوئے دریچہ بند کیا تھا اور شکستہ قدموں سے چلتا ہوا بیڈ پہ آ کے گر سا گیا تھا۔ واقعی جسے وہ گنگنا نہیں سکتا تھا' وقت نے اسے وہ گیت کیوں سنایا تھا۔ کیوں؟ تڑپ کر شکوہ کرتے ہوئے اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں گرا لیا تھا۔ ہجر یاراں کی اذیت ایک بار پھر عروج پہ تھی۔ آج کی رات بڑی لمبی ہونے والی تھی۔

☼ ☼ ☼

"پاپا۔ آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟" اگلی صبح وہ چاروں ناشتے کی میز پہ موجود تھے' جب طوبیٰ نے انتہائی سنجیدگی سے موضوع کی طرف پیش رفت کی تھی۔

"کیا کر رہا ہوں میں؟" انہوں نے لحظہ بھر کو ہاتھ روکتے ہوئے بیٹی کی طرف دیکھا تھا۔ طوبیٰ اک گہری سانس لے کر رہ گئی۔

"آپ اپنی سرجری میں دیر کیوں کر رہے ہیں؟ آپ کو پتا ہے کل احمد انکل خود گھر آئے تھے۔"

"او... اب سمجھا۔ اس لیے کل رات سے تمہاری اماں جان کا موڈ خراب ہے۔" انہوں نے ایک مسکراتی نظر خاموش بیٹھی ارجمند بیگم پہ ڈالی۔ تو وہ خفگی سے چہرہ دوسری جانب موڑ گئیں۔

"پلیز پاپا! یہ مذاق میں اڑانے والی بات نہیں ہے۔ آپ کیوں اس مسئلے کو سنجیدہ سے نہیں لے رہے؟" طوبیٰ کے چہرے پہ پھیلی التجا حسن صاحب کو بھی سنجیدگی ہونے پہ مجبور کر گئی تھی۔

"کروا لوں گا بیٹا۔ بس ذرا ایک ڈیل پشاور میں ہو رہی ہے۔ وہ فائنل ہو جائے پھر کروا لوں گا۔"

"اور یہ ڈیل کب تک فائنل ہو گی؟" ارجمند بیگم کے استہزائیہ انداز پہ حسن صاحب مسکرا دیے۔

"ایک دو دن تک۔ میں کل پشاور کے لیے روانہ ہو رہا ہوں۔ آپ میری پیکنگ کروا دیجیے گا۔" اس اطلاع پہ اماں جان کی خفگی دوچند ہو گئی۔

"یہ حال ہے۔ بتانا تک گوارا نہیں کیا۔" انہوں

نے ناراضی سے شوہر کی طرف دیکھا۔

"ارے بابا بتانے والا تھا۔ تم لوگ موقع تو دو۔" مگر اماں جان سر جھکتی چائے کی پیالی کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔ طوبیٰ نے ایک نظر ماں پہ ڈالتے ہوئے باپ کی طرف دیکھا تھا۔

"بس تو پھر یہ طے ہے کہ آپ پشاور سے آنے کے فوراً بعد اپنا آپریشن کروائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" بیٹی کے اصرار پہ وہ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ ان کے جواب نے ان تینوں کے چہروں کو کھلا دیا تھا۔ جسے دیکھ کر حسن صاحب کے لبوں پر بوجھل سی مسکراہٹ ابھری تھی۔ ان بچیوں کی فکر ہی تو انہیں اس سرجری سے روکے ہوئے تھی۔ یہ خیال کہ اگر انہیں کچھ ہو گیا تو ان کا کیا بنے گا؟ انہیں ہر بار اس فیصلے سے روک دیتا تھا۔ سچ ہے 'انسان جب تک تنہا ہوتا ہے بہادر ہوتا ہے۔ وہ بہت سے کڑے مراحل سے با آسانی گزر جاتا ہے' لیکن جب اس کی ذات کے گرد رشتوں کی ڈور لپٹ جاتی ہے تو وہ اپنی ساری بہادری بھول کر بزدلی کی راہ اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

"میں آج ہی احمد انکل سے کہہ کر آپ کے لیے ٹائم لیتی ہوں۔" طوبیٰ انہیں مزید موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔

"لے لینا۔ اچھا یہ بتاؤ رجا کی منگنی آج رات ہے نا؟" انہوں نے قصداً بات کا رخ موڑا تھا۔

"جی۔" طوبیٰ کا چہرہ اس ذکر پہ پھیکا پڑ گیا تھا۔ گزشتہ رات اس پہ بہت بھاری گزری تھی۔ پتا نہیں اسے نوفل سے ہونے والے ٹکراؤ کا ذکر ان سب سے کرنا چاہیے تھا یا نہیں؟ وہ اگر اس شہر میں آیا تھا تو اسے کم از کم اس کے والدین سے تو آ کر ملنا چاہیے تھا۔ اتنا حق تو وہ اس پہ رکھتے تھے' لیکن پھر وہ نجانے کتنی بار یہاں سے ہو کے جا چکا تھا۔ کون کیا کہہ سکتا تھا بھلا؟ وہ ایک بوجھل سی سانس لیتی ٹھنڈی ہوتی چائے کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"او کے مسٹر جاہ۔ ہمیں آپ کی آفر منظور ہے۔" ڈیڑھ گھنٹے کی تفصیلی میٹنگ کے بعد ڈاکٹر کریم نے مسکراتے ہوئے فیصلہ نوفل کی توقع کے عین مطابق سنایا تھا۔ "آئی مسٹ سے۔ میں نے آپ کی عمر میں اتنی قابلیت اور میچورٹی بہت کم دیکھی ہے۔" ڈاکٹر کریم کی آنکھوں میں اس کے لیے واضح ستائش تھی۔ وہ انکساری سے مسکرا دیا۔

"بہت شکریہ۔" اس ڈیل نے اس کی کمپنی کے لیے کامیابی کا ایک اور دروازہ کھول دیا تھا۔ وہ اپنے آفس کے چند اہم بندوں کے ساتھ اسی پراجیکٹ کے سلسلے میں لاہور آیا تھا۔

"لیکن ہمیں اس معاملے میں آپ لوگوں کا تھوڑا سا تعاون مزید درکار ہو گا۔"

"جی فرمائیں۔" نوفل ہمہ تن گوش تھا۔

"ایسا ہے نوفل صاحب کہ ہمارے اسپتال کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ اس نئے بلاک کی تعمیر پہ صرف ہو رہا ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ یہاں ہر چیز اعلا اور بہترین ہو۔ اس لیے ہم چاہیں گے کہ آپ کی کمپنی سے جتنی بھی مشینری یہاں آئے اسے آپ اپنی نگرانی میں نصب کروائیں تاکہ کسی غلطی یا خرابی کا احتمال نہ رہے اور اس کے لیے ہم آپ کو اور آپ کی فیملی کے لیے اپنے اسپتال کی ڈاکٹرز کالونی میں رہائش کا بندوبست بھی کر کے دیں گے تاکہ آپ کو کوئی مشکل نہ پیش آئے۔" انہوں نے نوفل کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی بات مکمل کی تو وہ ایک پل کے لیے خاموش ہو گیا۔

ایک بات تو طے تھی کہ وہ اس شہر میں نہیں رہنے والا تھا' لیکن وہ فوری طور پر انکار کر کے اتنی اچھی ڈیل کو خراب کرنے کی حماقت نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی کمپنی کا کوئی بھی ذمہ دار آفیسر اس پراجیکٹ کو سپروائز کرنے کے لیے یہاں آ سکتا تھا۔

نوفل کا کراچی میں اپنے ایک دوست کے ساتھ بہت بڑے پیمانے پہ اسپتالوں میں استعمال ہونے والی مشینری کا بزنس تھا۔ وہ بیش قیمت یونٹس یورپ سے درآمد کر کے پورے ملک میں سپلائی کرتے تھے۔ لاہور

میں بھی ایک مشہور اسپتال کو' اپنے نئے بننے والے حصے کے لیے بہت سی مشینری درکار تھی۔ انہوں نے اس سلسلے میں نوفل جاہ کی کمپنی سے رابطہ کیا تھا اور آج ان کے درمیان وہی ڈیل فائنل ہوئی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ ہم اس معاملے میں کوئی نہ کوئی ارینج منٹ کرلیں گے۔" اس کے مثبت جواب پہ ڈاکٹر کریم مسکرادیے تھے۔

ریفریشمنٹ کے بعد اسپتال کی انتظامیہ نے اسے پورے اسپتال کا ایک سروے کروایا تھا۔ وہ شعبہ حادثات کی راہداری میں کھڑا چند ضروری تبدیلیوں پہ بات کررہا تھا۔ جب اچانک دائیں جانب سے وارڈ کا عملہ تیزی سے دو اسٹریچرز کو آگے پیچھے دوڑاتا اندر داخل ہوا تھا۔ وہ سب ہی بے اختیار ایک طرف کو ہٹے تھے۔

آن واحد میں ان کی توجہ کا مرکز اسٹریچر پہ پڑے افراد بن گئے تھے۔ جو بری طرح زخمی تھے۔ اس دوران ایک اسٹریچر نوفل کے پاس سے گزرا تو اس کی تاسف زدہ نگاہیں۔ خون میں لت پت شخص کے چہرے سے جا ٹکرائی تھیں جو ہوش و حواس سے بیگانہ تھا۔ وہ بری طرح ٹھٹک گیا تھا۔ اسے یہ چہرہ مانوس سا لگا تھا بے چینی سے آگے آتے ہوئے اس نے ایک گہری نظر خون میں چھپے خدوخال پر ڈالتے ہوئے انہیں پہچاننے کی کوشش کی تھی اور جونہی یہ مرحلہ طے ہوا تھا اس کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔

"خیر تو ہے نوفل صاحب آپ اتنے پریشان کیوں ہوگئے ہیں؟" اسپتال کے انچارج اس کے قریب چلے آئے۔ اس کی الجھی ہوئی نگاہیں ان کے چہرے پہ آٹھہری تھیں۔

"کیا کروں؟" اس کے اندر جیسے ایک جنگ سی چھڑ گئی تھی۔ اس کی نظریں ایک بار پھر ایمر جنسی کے دروازے پہ جا اٹکی تھیں۔ نہیں۔ وہ اتنی بے حسی کا مظاہرہ نہیں کرسکتا تھا۔ سنگدلی اس کے خون کا خاصہ ہی نہیں تھی۔ بوجھل سانس لیتے وہ جیسے کسی فیصلے پر پہنچ گیا تھا۔

"ابھی جن دو زخمیوں کو اندر لے جایا گیا ہے۔ ان میں سے ایک میرے بابا کے دوست ہیں۔" وہ دھیرے سے گویا ہوا تو ڈاکٹر کریم کے چہرے پہ تاسف پھیل گیا۔

"اونو...." وہ لحظہ بھر کو خاموش ہوئے۔ "آپ فکر نہیں کریں۔ میں ابھی خود جاکر ان کی کنڈیشن دیکھتا ہوں۔" وہ اس کا بازو تھپتھپاتے اپنے ساتھ موجود ڈاکٹرز کو لیے آگے بڑھ گئے تو نوفل لب بھینچے وہیں راہداری میں کھڑا ہوگیا۔ قسمت کب اور کہاں کس کی آزمائش کا سامان کردے کوئی نہیں جانتا اور وہ کم از کم اس امتحان کی گھڑی میں انسانیت کے درجے سے نیچے نہیں گرنا چاہتا تھا۔

☆ ☆ ☆

سائرن بجاتی ایمبولینس جس وقت سیاہ گیٹ کے اندر داخل ہوئی تھی۔ ایک کہرام تھا جو چاروں طرف برپا ہوگیا تھا۔ یہ اچانک کیا ہوگیا تھا؟ کیسے ہوگیا تھا؟ وہ اپنے عزیز از جان بابا کے دل کو لے کر پریشان تھیں اور موت نے ان پہ وہاں سے حملہ کردیا تھا جہاں سے انہوں نے کبھی گمان بھی نہیں کیا تھا۔ کاش کوئی علم' کوئی حساب انہیں موت کی اس چال بازی سے آگاہ کردیتا تو وہ کبھی اپنے پیارے پاپا کو اس گاڑی میں سوار نہ ہونے دیتیں' جو انہیں ایئرپورٹ لے جانے کے لیے گھر سے نکلی تھی' لیکن راستے میں ہی ایک تیز رفتار ٹرالر سے ٹکرا کے ہمیشہ کے لیے اپنی منزل کا نشان کھو بیٹھی تھی۔

حادثہ اتنا شدید تھا کہ ڈاکٹرز کی تمام تر کوششوں کے باوجود حسن صاحب اور ان کا ڈرائیور دونوں ہی دم توڑ گئے تھے اور باہر منتظر کھڑا نوفل جاہ ہک دک رہ گیا تھا۔

"کیا یہی ہے انسان کی اوقات؟ یہی ہے اس کے اختیار کی حد کہ اپنے اگلے سانس کی قسم نہیں کھا سکتا اور دعوے آسمانوں کو تسخیر کرنے کے ہیں۔ حسن مجتبیٰ نے جو کچھ جمع کیا تھا کیا ساتھ لے جا پائے تھے؟ نہیں! سب یہیں دھرا کا دھرا رہ گیا تھا۔ اور وقت رخصت آپہنچا تھا۔" دکھ سے سوچتے ہوئے اس کی آنکھوں میں

سی پھیل گئی تھی۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے حسن صاحب کے گھرانے کے بہت سے افراد اسپتال پہنچ گئے تھے۔ ایسے میں اگر وہ چاہتا تو خاموشی سے وہاں سے جا سکتا تھا' لیکن وہ اپنے اس دل کا کیا کرتا جو کسی طور اس دشمن جاں کو زندگی کے اس کڑے ترین مرحلے پہ تنہا چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ پہلی بار اسے بہت شدت سے 'غلط وقت اور غلط جگہ' پہ اپنی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔

ایمبولینس کے پیچھے جب اس کی گاڑی "حسن ولا" کے گیٹ پہ آکر رکی تھی تو اس کا دل پانی ہونے لگا تھا۔ بے اختیار اس کی نظریں "حسن ولا" کے برابر کھڑی سفید عمارت پہ جا ٹھہری تھیں۔ جس کے در و دیوار سے لپٹی عشق پیچاں کی بیلیں اس کے پورے وجود پہ کمند سی ڈالنے لگی تھیں۔ دس سال بعد اس علاقے اور اس گلی میں اس کی واپسی ہوئی تھی اور یہ واپسی حسن مجتبیٰ کے جنازے کے ساتھ ہونا تھی' اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ سینے میں اٹھتی اذیت کی لہروں کو دبائے وہ اپنے بے وزن وجود کے ساتھ اس دہلیز کے پار چلا آیا تھا جہاں قدم رکھنے کا خیال وہ عرصہ پہلے دل سے نکال چکا تھا۔ اندر برپا قیامت نے اس کے اعصاب مزید بوجھل کر دیے تھے۔ ماہ نور کا پچھاڑیں کھاتا وجود اور ارجمند بیگم کا لٹا پٹا سا انداز اس کی آنکھیں نم کر گیا تھا۔ اس کی نظروں نے بے چینی سے طوبیٰ کے وجود کو تلاشا تھا۔

وہ اپنے باپ کو بے حد چاہتی تھی۔ ایسی چاہنے والی بیٹی کو جہاں ہونا چاہیے تھا وہ اسے وہیں ملی تھی.... باپ کی پٹی کو تھامے وہ بے یقینی' شکستگی اور یاسیت کی تصویر بنی ایک ٹک زمین کو دیکھے جا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بالکل بنجر تھیں۔ ان بنجر آنکھوں کے آنسو کہاں گر رہے تھے نوفل اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ کرب کی انتہا پر تھی اور اس کی اذیت نوفل جاہ کے دل کو چیرے دے رہی تھی مگر وہ بے بس تھا۔ مکمل طور پہ بے بس!

☆ ☆ ☆

نگین نے کوئی چوتھی بار نوفل کا نمبر ملایا تھا۔ بیل جا رہی تھی' مگر اب بھی دوسری طرف سے اٹھانے والا کوئی نہ تھا۔ لب بھینچے وہ کال کاٹنے کو تھی جب غیر متوقع طور پہ دوسری طرف سے کال ریسیو کر لی گئی تھی۔

"ہیلو! ہیلو نوفل کہاں ہو تم؟" اس کی بے چینی عروج پہ تھی۔

"میں ایک جنازے میں شریک ہوں نگین۔ تم سے بعد میں بات کرتا ہوں۔"

"جنازہ؟ کون فوت ہو گیا ہے۔" نگین کے چہرے پہ پریشانی پھیل گئی تھی۔

"ہماری فیملی کے پرانے ملنے والے تھے۔"

"تو تم صبح سے وہیں ہو؟" نوفل کے جواب پر اس نے تعجب سے پوچھا تھا۔

"ہاں۔" اور وہ بے اختیار خاموش ہو گئی تھی.... ملنے والوں کے لیے اتنا تردد؟ اسے حیرت نے آن گھیرا تھا۔ تب ہی ایک جھماکا سا ہوا تھا اور اس کے ذہن میں پرسوں شام ٹکرا جانے والا بارش میں بھیگتا وجود گھوم گیا تھا۔

"کہیں یہ وہی ملنے والے تو نہیں جن کی بیٹی سے پرسوں ہماری ملاقات ہوئی تھی؟" اس کی آواز میں اندیشے بول رہے تھے' مگر نوفل کو وہ کہاں سنائی دیے تھے۔ ہاں لیکن طوبیٰ کے ذکر پہ وہ دکھ کے باعث ایک پل کو خاموش ضرور ہو گیا تھا۔

"ہاں' اس کے فادر کی ڈیتھ ہوئی ہے۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ دھیرے سے بولا تو اس کی آواز میں در آنے والی دل گرفتگی نگین کو بری طرح چونکا گئی۔

"آئی سی۔" اس کی بھنویں سکڑ گئی تھیں۔ نگاہوں کے سامنے ناچاہتے ہوئے طوبیٰ کا چہرہ آٹھہرا تھا۔

"اچھا نگین میں تم سے بعد میں بات کروں گا۔" نوفل کا عجلت بھرا انداز اسے لب بھینچنے پہ مجبور کر گیا تھا۔ وہ محض ہنکارا ہی بھر سکی تھی مگر دوسری طرف شاید اسے بھی سننے کی زحمت نہیں کی گئی تھی اور رابطہ

منقطع ہو گیا تھا۔ یہ حرکت نگین فاروق کو سر تا پا سلگا گئی تھی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا موبائل ایک طرف پٹخا تھا اور ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"بات کچھ اور ہے۔" بے چینی سے کمرے کا طول و عرض ناپتے اس کی الجھن عروج پہ پہنچ گئی تھی طوبیٰ حسن کا وجود اسے یکایک سرخ رنگ میں ڈوبا خطرے کا نشان نظر آنے لگا تھا۔ نوفل نے بات کر کے فون جیب میں رکھا تھا جب ایک خیال نے اس کا دامن اچانک سے تھاما تھا۔

"مجھے پہلے یہ خیال کیوں نہیں آیا؟" اپنی بے دھیانی کو کوستے ہوئے اس نے موبائل نکال کر لمحہ بھر کو سوچا تھا اور پھر اک گہری سانس لیتے ہوئے اپنے گھر کا نمبر ملانے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ سب کچھ دیر پیشتر قبرستان سے لوٹے تھے۔ تنہائی ملتے ہی ضیا باپ کے پاس چلا آیا تھا۔

"بس ڈیڈ اب میں مزید انتظار نہیں کر سکتا۔ آپ میرے اور طوبیٰ کے معاملے کو نپٹانے والی بات کریں۔ اب تو حسن چچا کا بھی مٹنا نہیں رہا۔"

"میں بھی وہی سوچ رہا ہوں۔" وہ پر سوچ انداز میں بولے تو ضیا بے چینی سے ان کے قریب آبیٹھا۔

"سوچنا نہیں ہے۔ آپ نے یہ کام کر کے رہنا ہے۔ مجھے عثمان اور عمر چچا پر بالکل بھروسا نہیں۔ اگر وہ بیچ میں اپنی کسی اولاد کو لے کر کود پڑے یا کوئی اور مسئلہ کھڑا کر دیا تو یہ سنہری موقع ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔"

"ہوں.... تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ان لوگوں کا واقعی کوئی بھروسا نہیں۔" انہوں نے بیٹے کو دیکھتے ہوئے تائید میں سر ہلایا۔ وہ سب بہن بھائی اپنی آل اولاد کے ساتھ "حسن ولا" میں موجود تھے۔ جبکہ نوفل واپس اپنے ہوٹل جا چکا تھا۔ وہ ابھی تک ارجمند بیگم سے بھی نہیں ملا تھا۔ اس کے نزدیک ان کی ذہنی اور جذباتی کیفیت زیادہ اہم تھی۔ بجائے ان کو وہاں اپنی موجودگی سے آگاہ کرنے کے۔

"جاؤ جا کر اپنی ماں کو بھیجو ذرا۔" ان کی بات پر ضیا اٹھ کر باہر نکل گیا تو علی مجتبیٰ اس سوچ میں پڑ گئے کہ کیسے اس موقعے پہ اس معاملے کو اٹھائیں کہ وہ با آسانی اپنا مقصد بھی پالیں اور دنیا کی نظروں میں برے بھی نہ بنیں۔ مگر وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ تدفین کے محض چند گھنٹوں بعد یہ گری ہوئی باتیں سوچنے والے وہ واحد انسان نہیں تھے۔ حسن صاحب کی اچانک موت کے بعد ان بھائیوں کے علاوہ **عصمی** پھپھو کی فیملی کی نیت میں بھی فتور آ گیا تھا۔

"ہاں تو کیا برا ہے اگر آپ دانش بھائی کے لیے طوبیٰ کا رشتہ مانگ لیں گی۔" زارا نے بیٹی کو تھکتے ہوئے ماں کی طرف دیکھا۔ "مامی تو اب جلد از جلد بیٹیوں کو ان کے گھر کا کرنے کا سوچیں گی۔"

"اپنی پھپھی کو دیکھا ہے۔ جان کھا جائیں گی میری۔" ان کا اشارہ تائی جان کی طرف تھا۔

"کیوں کھا جائیں گی؟ حسن ماموں اور ارجمند مامی نے پہلے دن سے ضیا کے رشتے کو قبول نہیں کیا آپ نے بھی ہر ممکن کوشش کر کے دیکھ لی۔ وہ لوگ نہیں مان رہے بات ختم۔ اب یہ کیا کہ خاندان میں کوئی اور طوبیٰ کے لیے بات ہی نہیں کر سکتا۔"

"یہی سمجھ لو۔ علی بھائی کسی صورت پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں اور پھر اگر ہم یہ بات کریں بھی تو کس بل بوتے پہ؟ اپنے بھائی کو دیکھا ہے۔ اس فاریہ کے چکر میں کس بری طرح سے پھنسا ہوا ہے۔" **عصمی** نے خفگی سے بیٹی کو دیکھا۔

"تو پھر خوش ہو جائیں۔ یہ بات دانش بھائی نے چند دن پہلے مجھ سے خود کہی تھی۔" زارا مسکرا کے بولی تو عصمت بیگم بے یقینی سی خوش گواری لیے اسے دیکھنے لگیں۔

"کیا.... ! اس نے خود طوبیٰ کا نام لیا ہے؟" ان کے چہرے پہ دبا دبا سا جوش تھا۔

"نہیں طوبیٰ کا نام تو نہیں لیا، لیکن انہیں اس کے نام پہ کوئی اعتراض بھی نہیں۔"

"کیا مطلب؟" وہ بے اختیار چونکی تھیں۔

"مطلب یہ کہ پچھلی مرتبہ جب میں آپ کی طرف آئی تھی تو بھائی بھی گھر پہ ہی تھے۔ وہ اور میں لاؤنج میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے جب ان کی شادی اور پھر فاریہ کا ذکر چل نکلا۔ تب انہوں نے مجھے ڈھکے چھپے الفاظ میں بتایا تھا کہ وہ اب فاریہ سے شادی نہیں کرنا چاہتے بلکہ وہ کسی ایسی لڑکی سے رشتہ جوڑنا چاہتے ہیں جو کہ ایک مضبوط فیملی سے تعلق رکھتی ہو تاکہ وہ اپنے بزنس کو مزید بڑھا سکیں۔ تب ان کی بات سن کے میں نے خود طوبیٰ کا نام لیا تھا اور انہیں میری بات پسند آئی تھی۔"

"یا اللہ تیرا شکر ہے۔ اس فاریہ سے تو جان چھوٹی۔" عصمت بیگم نے نہال ہوتے آسمان کی طرف ہاتھ بلند کیے تھے۔

"مگر ایسا ہے تو پھر ماہ نور میں کیا برائی ہے۔ وہ بھی تو اتنی ہی زمین جائیداد کی مالک ہے جتنی کہ طوبیٰ۔" ان کی بات پہ زارا سیدھی ہو بیٹھی۔

"نہیں امی دونوں میں عمروں کا فرق زیادہ ہے۔"

"کوئی زیادہ نہیں۔ آٹھ نو سال کا فرق کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہوتی اور پھر خاندان کے رشتوں میں تو یہ چیزیں بالکل بھی نہیں دیکھی جاتیں۔"

"ٹھیک ہے۔ اگر ایسا ہے تو آپ ماہ نور کا رشتہ مانگ لیں۔" زارا نے کندھوں کو خفیف سی جنبش دی۔

"احمر آجائے پھر بات کرتی ہوں۔ تب تک تم بھی بھائی سے پوچھ لو۔" زارا نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ماں کو دیکھا۔

"کس دن کی فلائٹ ہے احمر بھائی کی؟"

"پرسوں کی۔" انہوں نے بے اختیار اک آہ بھری۔ "بے چارہ بچہ باپ کا چہرہ بھی نہیں دیکھ سکا۔" انہیں یک لخت ملال نے آن گھیرا تھا۔

"رہنے دیں۔ انہیں زندہ باپ کا چہرہ دیکھنے کی کوئی خواہش نہیں تھی تو مرے ہوئے باپ سے کتنی انسیت ہو سکتی تھی بھلا۔" زارا نے کان پہ سے مکھی اڑائی۔

"صحیح کہہ رہی ہو۔ ویسے اس معاملے میں بڑا بدنصیب نکلا حسن۔"

"ہاں۔" زارا نے بے دھیانی سے کہتے ہوئے گھڑی کی طرف دیکھا۔ "میں جا کر ذرا کھانے کا پتا کرواؤں۔ سخت بھوک لگ رہی ہے مجھے۔" بچی پہ کمبل برابر کرتے ہوئے وہ بیڈ سے نیچے اتری۔

"ہاں دیکھو۔ جا کر میں نے بھی صبح سے کچھ بھی ڈھنگ سے نہیں کھایا ہوا۔" ان کی بات پہ زارا اثبات میں سر ہلاتی باہر نکل گئی تو عصمت بیگم اپنے پیچھے تکیہ درست کرتی آنکھیں موند گئیں۔ چند ہی لمحوں میں کمرہ ان کے خراٹوں سے گونجنے لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

بے سائبانی کی پہلی رات ان تین جانوں پہ بہت کڑی بہت تلخ گزری تھی۔ نقصان اتنا بڑا تھا کہ وہ تینوں ماں بیٹیاں ساری رات آنسوؤں سے اپنے زیاں کا کھاتا لکھتی رہی تھیں، مگر ازالے کی کوئی صورت بر آتی نظر نہیں آتی تھی۔ اور ان کے برابر میں ان کے بہت سے اپنے مزے سے خواب خرگوش کے مزے لوٹتے رہے تھے۔ یہاں تک کہ دن چڑھ آیا تھا اور گھر میں زندگی معمول سے زیادہ چہل پہل لیے بے دار ہو گئی تھی۔ مردوں کی فرمائشیں، بچوں کا اودھم، خواتین کی خوش گپیاں کسی کی ذات پہ کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ فرق پڑا تھا تو صرف انہیں جو یکایک زمانے کے سرد و گرم سہنے کو تنہا رہ گئی تھیں۔

"چچی جان، آپ سے تعزیت کے لیے کچھ خواتین آئی ہیں۔" عثمان تایا کی بیٹی نوشی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اپنے پیچھے آنے والی خواتین کو راستہ دیا تو ارجمند بیگم نے اپنی متورم آنکھیں اٹھاتے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا اور جونہی ان کی نظر آنے والوں کے پرخلوص اور مانوس چہروں سے ٹکرائی وہ ایک پل کے لیے حیران رہ گئیں۔

"صباحت بھابھی۔" ان کے لبوں سے نکلنے والا نام آنے والے کی آنکھیں بھی نم کر گیا تھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھی تھیں اور ارجمند بیگم کے گلے لگ گئی

تھیں جو بے اختیار اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ ان کے سینے سے لگتے ہی ارحمند کے صبر کا پیمانہ چھلک اٹھا تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی تھیں۔ ان کی آواز سن کے ان کی نند اور جیٹھانیاں اندر چلی آئی تھیں اور جونہی ان کی نظر آنے والی ہستی کے چہرے سے ٹکرائی تھی وہ چاروں بھی حیران رہ گئی تھیں۔

"طوبیٰ کچھ تو کھالو یار۔ اس طرح تو تمہاری طبیعت خراب ہو جائے گی۔" طوبیٰ کے کمرے میں وہ تینوں سہیلیاں اسے گھیرے بیٹھی تھیں۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہو رہی تھی۔ ماہ نور کو انہوں نے زبردستی تھوڑا سا پھل کھلا دیا تھا، لیکن طوبیٰ کے منہ میں کل سے ایک دانہ نہیں گیا تھا۔ اس کے چہرے پہ کھنڈتی زردی نے ان سب کو پریشان کر دیا تھا۔ اسی اثنا میں ہلکی سی دستک کے بعد دروازہ کھلا تھا اور کسی نے کمرے میں قدم رکھا تھا۔ ان تینوں نے بے اختیار آنے والی کی طرف دیکھا تھا جو دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی طوبیٰ کے مقابل دوزانو بیٹھ گئی تھی۔ قالین پہ جمی طوبیٰ کی خالی نگاہوں میں جنبش ہوئی تھی۔ اس نے نظریں اٹھائی تھیں اور پھر گویا پلکیں جھپکنا بھول گئی تھی۔

"ضحیٰ!" اس کے لب لرزے تھے۔ اگلے ہی لمحے وہ اپنی بچپن کی سہیلی کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی تھی۔

☆ ☆ ☆

"ہاں عالی... یہ لوگ آج یہاں سے روانہ ہو رہے ہیں۔ میں جمیل صاحب کے ہاتھ پراجیکٹ کی ڈیٹیل رپورٹ بھجوا رہا ہوں۔ تم ہر پوائنٹ غور سے دیکھ لینا، ہم پھر بعد میں ڈسکس کر لیں گے۔" وہ ہوٹل کے کمرے میں فون پر اپنے پارٹنر اور دوست سے محو گفتگو تھا، جب دروازے پہ دستک ہوئی تھی نوفل موبائل کان سے لگائے آگے بڑھا تھا۔ دروازہ کھلنے پر اس کی نظریں نگین کے چہرے سے ٹکرائی تھیں۔ اسے اندر آنے کا راستہ دیتا وہ بغور عالی کی بات سننے لگا تھا۔

"نہیں۔ نہیں۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہم میں سے کوئی اس پراجیکٹ کو اپنی نگرانی میں مکمل کروائے۔" وہ بولتا ہوا اندر چلا آیا تھا۔ نگین کو کمرے کے وسط میں کھڑا دیکھ کر اس نے ہاتھ سے صوفے کی جانب اشارہ کیا، مگر وہ ایک بے تاثر نظر اس پہ ڈال کر خاموشی سے دریچے میں جا کھڑی ہوئی تھی۔

"ان لوگوں کی پانچ بجے کی فلائٹ ہے، میں ان شاء اللہ تین چار دن میں واپس آجاؤں گا۔" اس کی بات پہ باہر نگاہیں جمائے کھڑی نگین کے لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے تھے۔ اس نے پلٹ کر ایک تیز نظر نوفل جاہ پہ ڈالی تھی اور سینے پہ ہاتھ باندھے اس کی طرف رخ موڑ گئی تھی۔ چند لمحوں کی مزید گفتگو کے بعد کال بند ہو گئی تو نوفل نے فون ایک طرف رکھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"کیسی ہو؟"

"شکر ہے۔ تمہیں مجھ سے حال احوال کرنے کی فرصت تو ملی۔" وہ استہزائیہ مسکراہٹ لیے بولی تو نوفل کے چہرے پہ ایک تھکی تھکی سی مسکراہٹ آٹھہری۔

"ایسی بات نہیں ہے۔ تم جانتی تو ہو کہ اچانک کتنی بڑی ایمرجنسی پیش آگئی۔"

"کتنی بڑی؟" اس کے چہرے پہ نگاہیں جمائے وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ تو نوفل بے اختیار چونک گیا۔

"آج آپ مجھے بتا ہی دیں نوفل صاحب کہ اس ایمرجنسی کی نوعیت کتنی سنگین ہے۔ کیونکہ جتنی فکر اور جتنا دکھ آپ کو اس سانحے کا ہوا ہے اتنا تو شاید ان کے اپنے عزیزوں کو بھی نہیں ہوا ہوگا۔"

"فضول باتیں مت کرو۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ وہ ہمارے پرانے فیملی فرینڈ ہیں۔" اس نے غصے سے نگین کی طرف دیکھا تو اس کے لبوں پہ طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ملنے والوں کے لیے اتنا تردد؟ کمال ہے۔ یاد ہے اس دن شاپنگ کے بعد میں نے تم سے کہا تھا کہ تین چار دن اور رک جاؤ۔ مزنیٰ کی منگنی بعد دونوں اکٹھے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

چلیں گے۔ تب تو تم نے کہا تھا کہ تمہارے بہت سے اہم کام رکے ہوئے ہیں کراچی میں۔ اب وہ اہم کام کہاں گئے نوفل صاحب؟" اس کا انداز نوفل کو سر تاپا سلگا گیا۔ وہ اس قسم کے لب و لہجے سننے کا عادی نہیں تھا۔
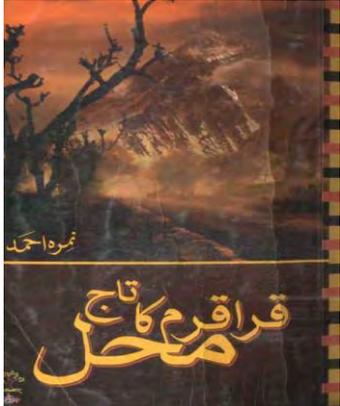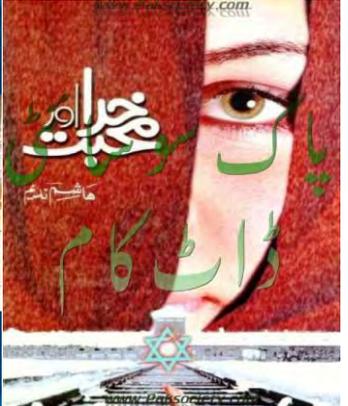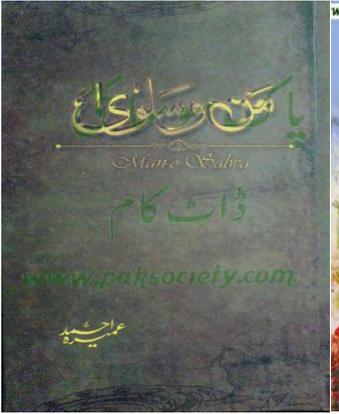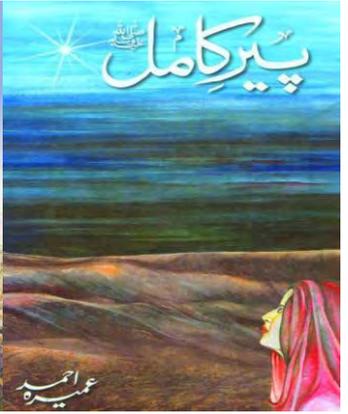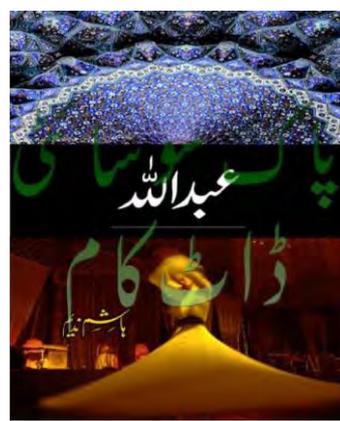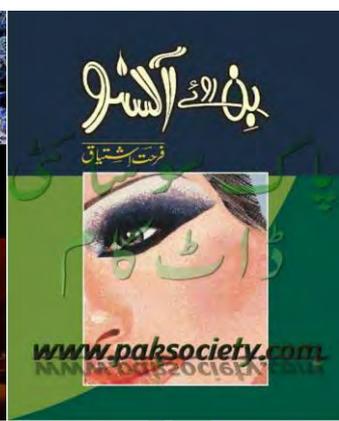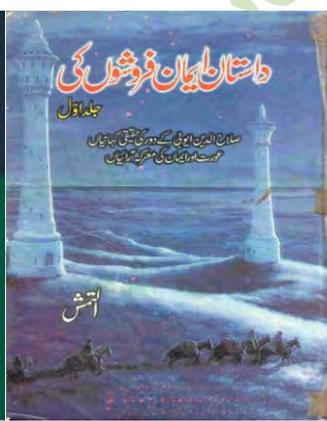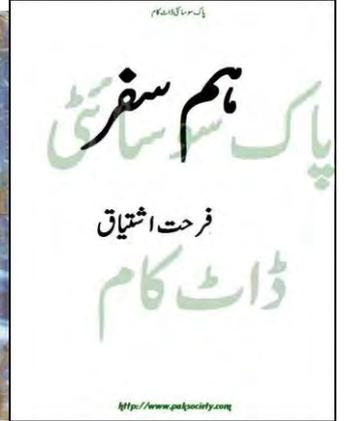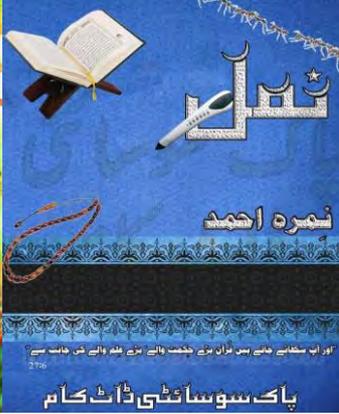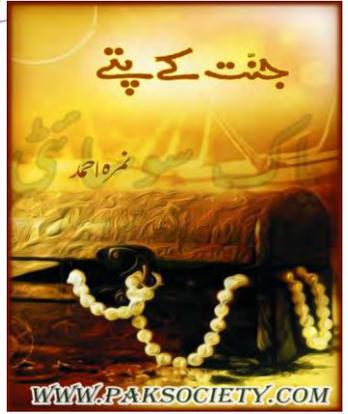
"تمہاری بہن کی منگنی کا مجھ سے بھلا کیا تعلق ہے؟" اس نے سارا لحاظ بالائے طاق رکھ دیا تو نگین فاروق کی خوب صورت آنکھوں میں چنگاریاں سی بھر گئیں۔

"اور اس محترمہ کے باپ کی فوتگی سے تمہارا کوئی اسپیشل تعلق ہے؟"

"نگین!" اس کے غصے سے پکارنے پہ نگین کے لبوں پہ کاٹ دار مسکراہٹ پھیل گئی۔

"بہت برا لگا ہے جناب کو؟"

"آئندہ مجھے ڈکٹیشن دینے کی ضرورت نہیں۔ ورنہ میں بھول جاؤں گا کہ تم میری دوست ہو۔" اس کا سرد لہجہ نگین کو لب بھینچنے پہ مجبور کر گیا' مگر اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی' نوفل کے فون کی بیل نے اسے اپنی جانب متوجہ کرلیا۔

"جی امی؟" اسکرین پہ "امی" لکھا دیکھ کے اس نے سرعت سے فون کان سے لگایا۔

"ایسا کرو بیٹا کہ تم ہمارا سامان لے کر یہاں آجاؤ۔"

"نہیں امی۔ میں نے آپ لوگوں کے لیے کمرہ بک کروالیا ہے۔" وہ ان کی بات سمجھ کے نفی میں سرہلاتا ہوا بولا تو نگین بری طرح چونک گئیں۔

"تو کیا نوفل کی فیملی بھی یہاں پہنچ چکی ہے؟" اس کے چہرے پہ تشویش پھیل گئی تھی۔

"میں نے ارجمند کو بتایا ہے' لیکن وہ ہمیں کسی طور چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔ یہی حال بچیوں کا بھی ہے اور سچ پوچھو تو میرا اور ضحیٰ کا بھی انہیں اس حال میں چھوڑ کے آنے کا بالکل دل نہیں۔ ہم اتنی دور سے ان کے غم میں شریک ہونے کے لیے آئے ہیں۔ کیا فائدہ جو ان کی دل جوئی نہ کرسکیں۔" صباحت دل گرفتہ سی بولیں تو نوفل خاموش ہوگیا۔

"تم سامان لے کر آجاؤ اور آکے ارجمند سے بھی مل لو۔ اسے جب سے پتا چلا ہے کہ تم کل سے نا صرف سارا وقت یہاں تھے بلکہ حسن بھائی کے ساتھ اسپتال میں بھی موجود تھے تو وہ تمہیں دیکھنے کے لیے بری طرح بے چین ہوگئی ہے۔" ارجمند بیگم نے اسے ہمیشہ احمر کی طرح چاہا تھا۔ نوفل کے لیے انہیں اس دکھ کی حالت میں دیکھنا بہت تکلیف دہ تھا اور پھر طوبیٰ؟ پتا نہیں اس کی کیسی حالت تھی؟ وہ اس سے ملنے والی بھی تھی یا نہیں؟۔

"میں آتا ہوں۔" وہ بوجھل لہجے میں بولا تو نگین کی پیشانی پہ بل پڑ گئے۔

"خیر سے آؤ۔" صباحت بیگم نے اسے دعا دیتے ہوئے رابطہ منقطع کردیا تو نوفل نے بھی ہاتھ میں پکڑا فون جیب میں رکھ لیا۔

"آنٹی کے ساتھ اور کون آیا ہے؟" خود پہ قابو پاتے ہوئے نگین نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ نوفل نے اک گہری سانس لی۔

"ضحیٰ۔" اس کے جواب پہ نگین ایک پل کو خاموش ہوگئی۔ یہ تو کچھ زیادہ ہی گہرا دوستانہ تھا' ورنہ ضحیٰ نے اس سے تو آج تک سیدھے منہ بات نہیں کی تھی۔

"میں جارہا ہوں۔ تمہیں ڈراپ کردوں؟" نوفل نے اس کی طرف دیکھا۔

"بہت شکریہ۔ میں جیسے آئی تھی ویسے ہی چلی جاؤں گی۔" وہ اسے تلخ نگاہوں سے دیکھتی' تیز قدموں سے دروازے کی طرف بڑھ گئی تو نوفل غصے سے سر جھٹکتا روم سروس کو بلانے کے لیے انٹرکام کی جانب متوجہ ہوگیا۔ نگین سلگتی ہوئی اپنی گاڑی میں آکے بیٹھی تو اس کا خون بری طرح کھول رہا تھا۔ یہ جو کچھ ہو رہا تھا' ٹھیک نہیں ہو رہا تھا۔

نوفل جاہ اس کی محبت نہیں۔ اس کا عشق تھا۔ اور آج سے نہیں یونیورسٹی کے زمانے سے تھا' مگر اس کے لیے اس محبت میں سب سے زیادہ تکلیف دہ پہلو جو رہا تھا وہ نوفل کی بے اعتنائی تھی۔ اس کے اتنے

حسن اور اتنی جاہت کے باوجود نوفل جاہ نے اسے ہمیشہ اپنی ایک اچھی دوست کے علاوہ اور کچھ نہیں سمجھا تھا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ وہ اس سے شدید محبت کرتی ہے۔ اس کے باوجود اس نے کبھی اس کے جذبات کی پذیرائی نہیں بخشی تھی۔ کیوں؟ کیوں؟ وہ نہیں جانتی تھی، مگر یہ بڑا کرب ناک احساس تھا۔

آج سے دس سال پہلے جب نوفل اس شہر سے کوچ کر گیا تھا تب اس کے لیے گویا قیامت برپا ہو گئی تھی۔ اس نے بہت مشکل سے اس کے بغیر وقت گزارا تھا اور پھر ایک دن نوکری کے بہانے وہ خود بھی اس کے پاس کراچی چلی گئی تھی۔ اس کی اس دیوانگی پہ اس کے گھر والوں نے بہت شور مچایا تھا، مگر اس نے کسی کی ایک نہ سنی تھی۔ وہ ویسے بھی بے حد خود سر لڑکی تھی۔ اپنے مزاج کے خلاف کوئی بات برداشت کر لینا اس کی سرشت میں شامل ہی نہیں تھا۔ تھک کر اس کے والد نے اس کے لیے کراچی میں ایک فلیٹ لے لیا تھا اور اپنی ایک بیوہ خالہ اور ان کی بیٹی کو اس کے پاس بھیج دیا تھا، مگر گزرتے وقت کے ساتھ اس کی پریشانی ایک بار پھر سر اٹھانے لگی تھی۔

اس کے ممی اور پاپا اس کی شادی کے خواہاں تھے، لیکن نگین کے لیے نوفل کے علاوہ کسی اور کو قبول کرنا ممکن تھا۔ دوسری طرف نوفل کی زندگی کے اپنے امتحانات اور مجبوریاں تھیں۔ وہ دل میں کسی اور کی محبت کو بسا کر، زندگی میں کسی دوسرے کو شامل کرنا خیانت تصور کرتا تھا۔ اس لیے اس نے نگین کی محبت کی طرف سے ہمیشہ آنکھیں بند رکھی تھیں، لیکن نگین کسی طور ہار ماننے کو تیار نہ تھی۔ وہ اس کی طرف سے ہمیشہ چوکس رہتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس معاملے کو لے کر بے حد پریشانی ہو گئی تھی۔

"نوفل جاہ! اگر اس سلسلے کی ایک بھی کڑی تمہارے دل سے جا کر جڑی نا، تو یاد رکھنا میں تمہاری زندگی تباہ کر دوں گی۔" نوفل کے ہیولے پہ نظریں جمائے اس کی سوچیں زہریلی ہونے لگی تھیں۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ چٹکی بجاتے میں معاملے کی تہ تک جا پہنچے۔

☼ ☼ ☼

ڈرائنگ روم کی فضا میں ارجمند بیگم کی سسکیاں ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہی تھیں۔ ملول سا نوفل، ان سے فاصلے پہ سر جھکائے بیٹھا تھا۔ وقت نے کتنے عجیب سے حالات میں ان کے ملنے کا سامان کیا تھا کہ دس سال بعد ایک دوسرے کو روبرو پانے کی خوشی پہ حسن مجتبیٰ کے بچھڑنے کا غم حاوی ہو گیا تھا۔

"تمہارا بہت شکریہ بیٹا کہ تم نے نا صرف خود اپنے انکل کی آخری رسومات میں شرکت کی، بلکہ بھابھی اور ضحیٰ کو بھی یہاں بلا لیا۔" ارجمند نے آنسو صاف کرتے ہوئے نوفل کی طرف دیکھا۔

"کیسی باتیں کرتی ہیں آنٹی یہ تو میرا فرض تھا۔" نوفل کے چہرے پہ ملال بکھر گیا تھا۔ یہ کیسا تکلف تھا جو ان کے بیچ حائل ہو گیا تھا۔ تب ہی ماہ نور اور ضحیٰ کے ہمراہ طوبیٰ اندر داخل ہوئی تھی۔ انہیں دیکھ کے نوفل بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"السلام علیکم نوفل بھائی۔" ماہ نور کے آگے بڑھنے پہ نوفل کا ہاتھ شفیق انداز میں اس کے سر پہ آٹھہرا تھا۔ وہ بے اختیار رو پڑی تھی۔

"روتے نہیں بیٹا، حوصلہ کرتے ہیں۔" اس کا نرم، مشفق لہجہ، نظریں جھکائے کھڑی طوبیٰ کی آنکھوں میں آنسو بھر گیا تھا۔ اس شخص کا وجود ہمیشہ سے ان سب کے لیے کتنی ٹھنڈک لیے ہوئے تھا پھر پتا نہیں وہ رک صرف اس کے لیے ہی کیوں جلتے ہوئے صحرا میں تبدیل ہو گیا تھا؟ اس سخت ترین وقت میں وہ ان کے ساتھ ساتھ رہا تھا، اس اطلاع نے طوبیٰ کو عجیب سی الجھن میں ڈال دیا تھا۔ کہاں تو وہ ملنے کا روادار نہ رہا تھا اور کہاں وہ ہر آن ان کے دکھ میں شریک ہونے کو آگیا تھا۔ یہ سب کیا تھا آخر؟

"کیسی ہو طوبیٰ؟" نوفل جاہ کی نظریں، نگاہیں جھکائے کھڑی طوبیٰ کے چہرے سے ٹکرائی تھیں اور اس کا دل کٹ کے رہ گیا تھا زرد رنگ، متورم آنکھیں

اور سائیں سائیں کرتا وجود' وہ اپنے اندر پھیلی وحشت کی عملی تصویر بنی کھڑی تھی۔ دوسری طرف اس کی نرم پکار طوبیٰ کی سماعتوں کو حیران کر گئی تھی۔ اس کی بھیگی آنکھیں اٹھی تھیں اور نوفل جاہ کے چہرے پہ آٹھہری تھیں۔

"ٹھیک ہوں۔" اس کے لہجے کی مردنی نوفل کو لب بھینچنے پہ مجبور کر گئی تھی۔ ضحیٰ اسے اپنے بازو کے گھیرے میں لیے مقابل رکھے صوفے پہ جا بیٹھی تھی۔

"احمر کب آرہا ہے آنٹی؟" نوفل نے بدقت اپنی نگاہیں اس سے چھڑاتے ہوئے' ارجمند بیگم کی طرف دیکھا تھا جو اس سوال پہ اک ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گئی تھیں۔

"کل کی فلائٹ ہے بیٹا۔"

"اس کی فیملی بھی ساتھ ہے؟"

"نہیں وہ اکیلا آرہا ہے۔" ان کے جواب پہ نوفل تاسف کے مارے خاموش ہوگیا تھا۔ احمر کی خود غرضی تو ہمیشہ سے اس کی ذات پہ حاوی رہی تھی۔

"اچھا آنٹی۔ میں چلتا ہوں۔" اس کی بات پر طوبیٰ کی نگاہیں بے اختیار اس کی طرف اٹھ گئی تھیں۔ وہ کتنے عرصے بعد نوفل جاہ کو اسی چھت کے نیچے کھڑا دیکھ رہی تھی۔

"تم کہیں نہیں جارہے۔ یہیں سب کے ساتھ رکو گے۔" ارجمند بیگم کے قطعی لہجے پہ نوفل کے چہرے پر بے بسی پھیل گئی تھی۔

"پلیز آنٹی اچھا نہیں لگتا۔ ویسے بھی کل صبح تو مجھے یہیں آنا ہے۔" اس کے انکار پر طوبیٰ کے لبوں پہ اک استہزائیہ مسکراہٹ بکھر کے معدوم ہوگئی تھی۔ وہ تو محض دنیاداری نبھا رہا تھا اور اس کی ماں گئے وقتوں کا مان لیے بیٹھی تھیں۔

"جب کل صبح یہیں آنا ہے تو اس وقت جانے کی کیا ضرورت ہے بھلا؟ اپنے گھر کے ہوتے ہوئے تم ہوٹل میں رکو یہ کوئی اچھی بات ہے؟" اور نوفل بے چارگی سے انہیں دیکھتا خاموش ہوگیا تھا۔ اس کے چہرے کا پھیکا پن طوبیٰ کو بے زاری لگا تھا۔ ایک لمحے کو تو اس کے جی میں آیا تھا کہ وہ ماں کو ٹوک دے کہ اس شہر میں نوفل جاہ کا ایک گھر اور بھی ہے۔ جہاں اس کی محبت رہتی ہے' مگر افسوس وہ ایسا چاہ کر بھی نہیں کر سکتی تھی۔ مصلحت کے تقاضوں نے اس کے لبوں پر خاموشی کا بند باندھ دیا تھا' مگر دل میں پھیلی بدگمانی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

رات کے کھانے کے بعد نوفل اندر موجود لوگوں سے گھبرا کے باہر لان میں چلا آیا تھا جو خلاف توقع خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا وسط میں رکھی کرسیوں میں سے ایک پہ آکے بیٹھ گیا تھا۔ یہاں آکے تو اس کی بے چینی سوا ہوگئی تھی۔ اس کی یادوں میں بسے "حسن ولا" سے اپنایت کا جو ایک احساس جڑا تھا وہ اب یکسر مفقود ہو چکا تھا۔ اجنبیت کے اس احساس نے اس کے دل کو عجیب سی یاسیت میں گرفتار کر دیا تھا۔ ہر چیز کتنی نزدیک ہو کے بھی کتنی دور ہوگئی تھی۔ وہ اس کے سامنے تھی' مگر پھر بھی اس کی نہ تھی۔۔۔ یہ احساس بڑا جان لیوا تھا۔ اپنا تھکا ہوا سر کرسی کی پشت سے ٹکاتے ہوئے اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی تھی۔ تب ہی اس کی نظریں حسن ولا کے دائیں طرف موجود سفید عمارت پہ جا ٹھہری تھیں۔ یہ ایک اور زخم تھا۔ جو یہاں آتے ہی کھل گیا تھا۔ اس سفید عمارت کی ایک ایک اینٹ سے اس کے باپ کی محنت اور اس کی ماں کے ارمان جڑے تھے۔ یہ کبھی ان کی خوشیوں کا محور و مرکز ہوا کرتی تھی۔ یہاں زندگی بہت آسان اور بہت محفوظ تھی' مگر تب تک جب تک بابا کا ساتھ تھا ان کے بعد تو جیسے ہر خوش گمانی دھواں ہوگئی تھی۔ بابا کا پیار ان کے مشفق سائے کا احساس' آج بھی اس کے اندر تازہ تھا۔ ابھی کل ہی کی تو بات تھی جب محب کی ضد پہ بابا نے نئی گاڑی خریدی تھی اور وہ سب اپنے گھر کے پورچ میں کھڑے اشتیاق سے اسے دیکھ رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

"واہ زبردست!" بلیک کلر کی اکارڈ کی چھت پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے محب کا چمکتا چہرہ دیدنی تھا جبکہ ضحیٰ کی تو خوشی کا عالم ہی کچھ اور تھا۔

"ہائے! یہ اتنی پیاری گاڑی ہماری ہے بابا؟" وارفتگی سے گاڑی کو تکتے ہوئے اس نے پلٹ کے منصور صاحب کی طرف دیکھا۔

"جی بابا کی جان یہ آپ ہی کی گاڑی ہے۔" مسکراتے ہوئے انہوں نے اس کے شانے کے گرد اپنا بازو پھیلایا تو اس نے محبت سے ان کے سینے پر اپنا سر ٹکا دیا۔

"سچ میں بہت پیاری ہے۔ میں طوبیٰ کو بلا کے لاتی ہوں۔" وہ تیزی سے الگ ہوتی دونوں گھروں کی درمیانی دیوار میں موجود چھوٹے سے دروازے کی طرف بھاگی تو منصور صاحب بے اختیار ہنس پڑے۔

"کیوں نوفل، تمہیں گاڑی پسند نہیں آئی بیٹا؟" انہوں نے خاموشی سے گاڑی کے پاس کھڑے نوفل کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا دیا۔

"کیوں نہیں بابا۔ اتنی خوب صورت چیز کو بھلا کوئی ناپسند کر سکتا ہے؟" وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ان کے پاس آکھڑا ہوا۔ "مگر ایک بات بتائیں۔ آپ نے اتنی مہنگی گاڑی کیوں لی؟"

"میں بھی یہی کہنے والی تھی۔ کیا ضرورت تھی بچوں کی ضد پر اتنی مہنگی گاڑی لینے کی؟" صباحت بیٹے کی بات سن کے قریب چلی آئیں۔

"میرے محب کی فرمائش تھی۔ اس لیے رد نہیں ہو سکی مجھ سے۔" انہوں نے نرم نگاہوں سے محب کی طرف دیکھا جو ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھا، اندر کی چیکنگ میں مصروف تھا۔ منصور جاہ کی اپنے تینوں بچوں میں جان تھی۔

"وہ تو سہی ہے، لیکن اتنا تو سوچیں کہ ہماری ساری جمع پونجی پہلے ہی اس گھر پہ لگ چکی ہے۔ اب ہمیں سب کچھ ان بچوں کے لیے نئے سرے سے جوڑنا ہے۔" بیوی کی فکرمندی پہ وہ مسکرا دیے۔

"پریشان مت ہو۔ سب کچھ ہو جائے گا۔ اب دیکھو نا اللہ نے حسن کو کتنا اچھا وسیلہ بنا دیا۔ ورنہ کاروبار کرنا میری بس کی کہاں بات تھی۔" ان کی بات پہ صباحت اک گہری سانس لیتی خاموش ہو گئیں۔

حسن مجتبیٰ اور منصور جاہ ایک دوسرے کے پرانے دوست تھے۔ حسن صاحب کا تعلق ایک کاروباری گھرانے سے تھا۔ جبکہ منصور صاحب کی فیملی میں سب ہی ملازمت پیشہ افراد تھے۔ وہ خود بھی گورنمنٹ کے ایک ادارے میں اعلا عہدے پہ فائز تھے، لیکن چونکہ ایمانداری ان کا خاصہ تھی۔ اس لیے گھر میں ہر نعمت کی موجودگی کے باوجود، دولت کی ریل پیل نہ تھی۔

آج سے کچھ سال پیشتر جب حسن صاحب نے اپنے بھائیوں سے علیحدگی کے بعد اپنا کاروبار الگ کیا تھا تب انہیں ایک پاٹنر کی ضرورت پیش آئی تھی۔ ایسے میں منصور جاہ نے اپنے ترکے میں ملنے والے حصے کو شراکتی بنیاد پہ حسن مجتبیٰ کے ساتھ کاروبار میں لگا دیا تھا۔ ان کا حصہ چونکہ حسن صاحب کے مقابلے میں کم تھا اور وہ کاروبار کو چلا بھی نہیں رہے تھے، اس لیے ہر ڈیل میں انہیں چالیس فیصد اور حسن مجتبیٰ کو ساٹھ فیصد ملتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ میں برکت ڈالی تھی۔ ان کا کاروبار دنوں میں ترقی کی نئی منزلوں کو پہنچ گیا تھا۔ یوں محض چند سالوں میں ہی منصور جاہ اس قابل ہو گئے تھے کہ اپنا گھر بنا سکتے۔

حسن مجتبیٰ کے مشورے سے انہوں نے ان کے گھر کے برابر والے پلاٹ پہ اپنے نئے گھر کی تعمیر شروع کی تھی۔ نئی طرز پہ بننے والے اس بنگلے کی ایک ایک چیز ان سب نے بہت پیار اور ارمانوں سے چنی تھی۔ دونوں گھروں کی درمیانی دیوار میں ایک دروازہ بھی رکھا گیا تھا، تاکہ آنے جانے میں آسانی ہو سکے۔

"جاہ پیلس" ان کی خواہشوں کے عین مطابق تیار ہوا تھا۔ مگر اس کی تعمیر میں، منصور صاحب کی اب تک کی تمام جمع پونجی صرف ہو گئی تھی۔ جس نے صباحت بیگم کو تھوڑا پریشان کر دیا تھا۔ ایسے میں اکارڈ جیسی مہنگی گاڑی کو دیکھ کے انہیں خوشی سے زیادہ فکر نے

آن گھیرا تھا اور کچھ یہی کیفیت نوفل کی بھی تھی۔ جس کے نزدیک انہیں فی الحال گاڑی بدلنے کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی۔

☆ ☆ ☆

ضحیٰ کے ساتھ طوبیٰ اور ماہ نور کی آمد نے پورچ میں نئی ہلچل مچادی تھی۔ ان کی خوشی پہ وہ تینوں بے اختیار مسکرا دیے تھے۔

"ہمیں نئی گاڑی میں آئس کریم کھلا کے لائیں نوفل بھائی۔" طوبیٰ کی فرمائش پہ نوفل نے باپ کی طرف دیکھا تھا۔ اتنے میں دوسری طرف سے ارجمند بھی مسکراتے ہوئے چلی آئی تھیں۔ احمر اپنے دوستوں کے ساتھ اور حسن صاحب ایک بزنس ڈنر میں شرکت کے لیے گئے ہوئے تھے۔

"بہت مبارک ہو بھائی جان اور بھابھی۔" وہ آگے بڑھ کے صباحت بیگم کے گلے لگیں تو ان کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"تمہیں بھی مبارک ہو۔ آخر کو تمہارے بھائی کی گاڑی ہے۔"

"بھائی کی نہیں۔ بھتیجے کی۔" محب نے ماں کی بات اچکی تو سب ہی بے اختیار ہنس دیے۔

"کوئی نہیں جی۔ یہ صرف انکل اور نوفل بھائی کی گاڑی ہے۔ آپ کے ساتھ تو وہ پھٹیچر بائیک ہی سوٹ کرتی ہے۔" طوبیٰ نے اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے اسے چڑایا۔

"ہونہہ۔ میں جانتا ہوں تم میری پرسنالٹی سے جلتی ہو۔" محب کی جوابی کارروائی پر ارجمند نے مسکراتے ہوئے انہیں ٹوک دیا۔

"اچھا اب شروع مت ہو جانا۔ اور تم دونوں چل کے کھانا ختم کرو۔" انہیں نے بیٹیوں کی طرف دیکھا۔

"نہیں ہم نوفل بھائی کے ساتھ آئس کریم کھانے جا رہے ہیں۔" طوبیٰ کے جوش سے کہنے پہ ارجمند بیگم نے اسے فہمائشی نظروں سے دیکھا۔

"کوئی ضرورت نہیں اسے پریشان کرنے کی۔ وہ ابھی تھکا ہارا آیا ہو گا۔"

نوفل نے اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر ایک کمپیوٹر انسٹیٹیوٹ کھولا ہوا تھا۔ جہاں وہ سب ہی دوست یونیورسٹی کے بعد شام میں مل کر پڑھایا کرتے تھے۔ منصور صاحب نے جب سے گھر بنایا تھا۔ نوفل نے ان سے اپنے جیب خرچ کی مد میں ایک روپیہ بھی نہیں لیا تھا۔ وہ اپنے اوپر کے سارے اخراجات اسی جاب سے پورے کیا کرتا تھا۔

"کیوں نوفل بھائی ہم آپ کو پریشان کر رہے ہیں؟" طوبیٰ نے منہ لٹکائے اس کی طرف دیکھا۔ نوفل مسکرا دیا۔

"بالکل نہیں۔ دراصل میرا تو اپنا دل چاہ رہا تھا آئس کریم کھانے کو۔" اس کی بات پہ جہاں طوبیٰ کا چہرہ جگمگا اٹھا تھا۔ وہیں ارجمند بیگم کی شکایتی نظریں اس پر آٹھہری تھیں۔

"کیوں انہیں اتنا سر پہ چڑھاتے ہو؟"

"میری پیاری آنٹی اتنا نہیں، بس تھوڑا سا۔" نوفل نے مسکرا کر انہیں اپنے بازو کے گھیرے میں لیا تو ارجمند بھی بے بسی سے سرہلاتی مسکرا دیں۔ اس کے مزاج کی یہی نرمی اور اچھائی تو اسے ہر دلعزیز بناتی تھی۔

☆ ☆ ☆

"آپ کو پتا چلا۔ منصور بھائی نے نئی گاڑی لی ہے؟" ارجمند نے حسن صاحب کے ہاتھ سے کوٹ لیا۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے ڈنر سے واپس لوٹے تھے۔

"معلوم ہے۔" بے تاثر لہجے میں کہتے ہوئے انہوں نے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی۔ لیکن ارجمند بیگم اپنے دھیان میں تھیں۔ اس لیے ان کے لہجے کو محسوس نہیں کر پائی تھیں۔

"اللہ پاک انہیں نصیب کرے، ماشاء اللہ بہت پیاری ہے۔"

"ہونہہ! وہ تو ہو گی ہی۔" استہزائیہ انداز میں ہنکارا بھرتے وہ بیڈ پہ بیٹھ کر جوتے اتارنے لگے تو اب کی بار ارجمند چونکے بنا نہ رہ سکیں۔

"آپ ایسے کیوں بول رہے ہیں؟" انہوں نے بغور شوہر کا چہرہ دیکھا۔

"تم نے وہ مثال تو سنی ہوگی..... دکھ جھیلیں بی فاختہ اور کوے انڈے کھائیں۔ بس ہمارے ساتھ وہی ہو رہا ہے۔" وہ کاٹ دار مسکراہٹ لیے گویا ہوئے تو ارجمند بے اختیار ٹھٹکیں۔

"حسن کچھ ہوا ہے کیا؟"

"کیوں تمہیں نظر نہیں آرہا کہ کیا ہو رہا ہے؟" انہوں نے جوابا" تیکھے چتون سے انہیں دیکھا۔ "نہیں یہاں دن رات پاگلوں کی طرح محنت کروں' خواریاں کاٹوں اور یہ صاحب مزے سے بیٹھ کر اپنے بینک بھریں۔ کہاں کا انصاف ہے یہ؟" انہوں نے تیوریاں چڑھائیں۔

"لیکن یہ سب تو آپ دونوں نے یوں ہی طے کر رکھا تھا۔ آپ جانتے تو تھے کہ منصور بھائی بزنس کرنا نہیں جانتے۔" ارجمند بیگم نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔

"وہ نہیں جانتا تھا۔ لیکن سیکھ تو سکتا تھا۔ مگر جب اسے گھر بیٹھے لاکھوں کا منافع مل رہا ہے۔ تو اسے پاگل کتے نے کاٹا ہے۔ جو وہ بزنس کے جھمیلوں میں پھنستا؟" ان کی بات پہ ارجمند بیگم نے اک گہری سانس لی۔

"آپ بدگمان مت ہوں۔ منصور بھائی کو اپنی نوکری سے فرصت ہی کب ملی ہے۔ جو وہ آپ کے ساتھ ہاتھ بٹائیں۔ ہاں اب اگر آپ مناسب سمجھیں تو نوفل کو اپنے ساتھ شامل کرسکتے ہیں۔"

"ہاں۔ یک نہ شد دو شد۔ میرا دماغ خراب ہے نا جو میں ایک کے بجائے دو دو شریک پیدا کرلوں۔ میں نے یہ نام مقام اپنی اولاد کے لیے بنایا ہے۔ منصور جاہ کی نسلوں کے لیے نہیں۔ میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔ میں اس کی بنیادی انویسٹ منٹ واپس کردوں گا۔ میں مزید اسے کما کما کر دینے والا نہیں!" وہ قطعی لہجے میں کہتے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تو ارجمند ٹک ٹک سی انہیں دیکھے چلی گئیں۔ حسن مجتبیٰ کی نیت میں آنے والا فتور انہیں صاف نظر آگیا تھا۔ ان کا کاروبار ترقی کی منزلیں طے کر گیا تھا اور وہ اب اپنی اس کامیابی کے مختار کل بننا چاہتے تھے۔

"لیکن اگر اس وقت منصور بھائی آپ کی مدد نہ کرتے تو آج آپ بھی اس مقام کو نہ پہنچ پاتے۔ تب آپ کو ان کے ساتھ کی ضرورت تھی حسن اور آج انہیں ہمارے ساتھ کی ضرورت ہے۔ آپ جانتے تو ہیں کہ انہوں نے اب تک کی اپنی ساری کمائی پہلے زمین کی خریداری اور پھر گھر پہ لگادی ہے۔"

"تو یہ میرا درد سر نہیں۔" حسن مجتبیٰ نے بے حسی سے سر جھٹکا تو ارجمند بیگم کی آنکھوں میں تاسف پھیل گیا۔

"حسن یہ تو اپنے دوست کے ساتھ زیادتی والی بات ہوگی۔"

"زیادتی والی بات تب ہوتی جب میں اس کی انویسٹ منٹ ہڑپ کرنے کے چکر میں ہوتا۔ اور تم بے فکر رہو۔ بہت پیسہ ہے اس کے پاس۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اتنی مہنگی گاڑی نہ لی جاتی۔" وہ بولتے ہوئے ڈریسنگ روم کی جانب بڑھ گئے تو ارجمند مارے دکھ کے بیٹھی کی بیٹھی رہ گئیں۔ انہیں آج زندگی میں پہلی بار اپنے شریک سفر کی سوچ پر افسوس ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

نوفل اپنے کمرے میں بیٹھا کمپیوٹر پہ کام کر رہا تھا۔ جب دھاڑ سے دروازہ کھول کے کوئی اندر داخل ہوا تھا۔ بری طرح چونکتے ہوئے نوفل نے آنے والے کی طرف دیکھا تھا۔ لیکن جوں ہی اس کی نظر کمر پر ہاتھ رکھے احمر سے ٹکرائی تھی۔ اس کے لبوں پر شریر سی مسکراہٹ آٹھہری تھی۔

"کتنوں میں اڑ گئے ہو؟"

"تین میں۔" اور نوفل کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ احمر دانت پیستا آگے بڑھا تھا۔

"دانت اندر کرلو ورنہ توڑ دوں گا۔ فساد کی جڑ!"

"تو میں کیسے ہوگیا فساد کی جڑ؟" وہ بامشکل تمام ہنسی کے درمیان بولا تو احمر نے اسے کھا جانے والی نظروں

سے گھورا۔

"کیا ضرورت تھی پاپا کو بتانے کی کہ آج رزلٹ آؤٹ ہو رہا ہے؟" وہ دونوں ایک ہی یونیورسٹی سے ایم۔بی۔اے کر رہے تھے۔

"مجھے کیا پتا تھا کہ تم نے انہیں نہیں بتایا؟" نوفل نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"ویسے بے عزتی زیادہ ہوئی ہے کیا؟" وہ شرارت سے آگے کو جھکا تو احمر کے چہرے پہ بے بسی پھیل گئی۔

"میں نے انہیں ابھی بتایا ہی کہاں ہے۔" وہ دل گرفتہ سا اس کے بیڈ پہ گر گیا۔

"تو آنٹی کو بتا دو۔ وہ خود ہی سنبھال لیں گی۔" نوفل کے مشورے پر احمر کرنٹ کھا کر سیدھا ہو بیٹھا۔

"جی۔ جی۔ انہیں بتا دوں نا کہ وہ تمہاری نیک سیرتی اور قابلیت پہ مجھے وہ سیر حاصل لیکچر دیں کہ میری طبیعت صاف کر دیں۔" اس نے کچکچا کے پاس پڑا تکیہ نوفل کو کھینچ مارا۔ جو اس نے ہنستے ہوئے کیچ کر لیا۔

"ہائے۔۔۔ میری پیاری آنٹی۔" تکیہ بازو میں دبائے اس نے حظ اٹھایا احمر اسے گھورتا بیڈ پہ چت لیٹ گیا۔ نوفل اسے دیکھتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"تو تھوڑا رٹہ لیتے نا۔" وہ چلتا ہوا بیڈ کے پاس آ کھڑا ہوا۔ اس کی نظریں لیٹے ہوئے احمر کے چہرے پہ جمی تھیں۔ جو چھت کو دیکھ رہا تھا۔

"میں پاپا کو بتا چکا ہوں۔ میں نے یہاں نہیں پڑھنا۔ میں نے باہر جانا ہے۔"

"یار باہر کیا رکھا ہے؟" نوفل بے زاری سے گویا ہوا۔ "یہاں انکل کا اتنا بڑا کاروبار ہے۔ اسے کون سنبھالے گا؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ مجھے بس اتنا پتا ہے کہ میں نے اپنی لائف پاکستان میں سیٹ نہیں کرنی۔" وہ قطعیت سے کہتا اٹھ کر بیٹھ گیا تو نوفل کی آنکھوں میں اسے دیکھتے ہوئے تاسف پھیل گیا۔ احمر حسن جیسا نصیب پانے کے نجانے کتنے بے روزگار نوجوان خواب دیکھا کرتے تھے اور ایک وہ تھا جسے اپنی زندگی میں موجود آسانیوں کی کوئی قدر ہی نہ تھی۔ سچ ہے 'انسان جیسی ناشکری مخلوق شاید ہی کوئی اور ہو' لیکن اس سے پہلے کہ نوفل اسے کچھ کہتا دستک کی آواز نے اسے دروازے کی طرف متوجہ کر دیا۔ اس نے آگے بڑھ کے دروازہ کھولا تو باہر طوبیٰ کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تیرتے دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا۔

"کیا ہوا طوبیٰ؟ تم کیوں رو رہی ہو؟" اس کے پوچھنے کی دیر تھی کہ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے پھپک کے رو پڑی تھی۔ تب ہی اس کے پیچھے ضحیٰ کا مسکراتا ہوا چہرہ نمودار ہوا تھا۔ نوفل نے اشارے سے پوچھا تو اس نے مسکراتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا پریکٹیکل جرنل آگے کر دیا۔

"محب بھائی نے کہا تھا کہ وہ ڈائیگرامز بنانے میں اس کی مدد کر دیں گے' لیکن انہوں نے۔۔۔" ضحیٰ نے جرنل کھول کے نوفل کے سامنے کیا تو نوفل کی ہنسی چھوٹتے چھوٹتے بچی۔ محب نے جگہ جگہ اوٹ پٹانگ شکلیں بنا کر اس کے جرنل کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔

"اوہو۔ بس اتنی سی بات تھی۔" اس نے طوبیٰ کے چہرے سے ہاتھ ہٹانے چاہے۔

"یہ اتنی سی بات نہیں نوفل بھائی۔ مجھے کل جرنل سبمٹ کروانا ہے۔" وہ روتے ہوئے بولی تو نوفل مسکرا دیا۔

"فکر مت کرو۔ میں بنا دوں گا۔"

"آپ سچ کہہ رہے ہیں؟" اس نے آنسوؤں بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا تو نوفل کا دل ڈول گیا۔ یہ پیاری سی گڑیا جو اس سے چھ سال چھوٹی تھی' کب اس کے دل میں آ بسی تھی۔ اسے پتا بھی نہیں چلا تھا۔

"میں نے تم سے کبھی غلط بیانی کی ہے؟" اس نے الٹا اس سے سوال کیا تو طوبیٰ آنکھیں صاف کرتی مسکرا دی اور نوفل کو لگا جیسے برستی بارش کے بعد اچانک نرم سی دھوپ نکل آئی ہو۔ اس نے ہاتھ بڑھا کے ضحیٰ کے ہاتھ سے جرنل لے لیا۔

"اور محب بھائی؟" اب وہ اپنے اگلے مدعے پر آئی تھی۔ یعنی محب جاہ کی شامت۔

"اسے میں پوچھ لوں گا۔"

"میرے سامنے پوچھیے گا ذرا۔" اس نے جوش سے کہا تو نوفل مسکرا دیا۔ اس کی اور محب کی ازلی دشمنی سے وہ سب ہی واقف تھے۔

"اچھا بابا تمہارے سامنے پوچھوں گا۔" اس کے تسلی دینے پہ وہ ضحیٰ کے ساتھ خوش خوش واپس پلٹ گئی تو نوفل نے مسکراتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔

"تم اس سوشل سروس سے تنگ نہیں آتے؟" احمر نے اس کے ہاتھ میں پکڑے جرنل کی طرف اشارہ کیا جب کہ اصولی طور پہ یہ جرنل اس وقت اس کے ہاتھ میں ہونا چاہیے تھا مگر اس نے کبھی اپنی بہنوں کو اتنا مان ہی نہیں دیا تھا کہ وہ اپنی پریشانیوں میں اس کے پاس دوڑی چلی آتیں۔

"اپنوں کے کاموں سے کیسا تنگ آنا میرے یار۔" وہ بنا کچھ جتائے خوش دلی سے بولا تو احمر سر ہلاتا اٹھ کھڑا ہوا۔

"صاف بات ہے۔ میں تو دنیا کو خوش کرنے کے چکر میں اپنی ذات کو مشکل میں نہیں ڈال سکتا۔"

"دنیا اور اپنوں میں بہت فرق ہوتا ہے احمر۔" نوفل رسان سے بولا' لیکن احمر اس کی بات کو ان سنی کیے شیشے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ بال بنا کر اس نے پرفیوم لگایا تو نوفل پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

"کہاں جا رہے ہو؟"

"سارہ سے ملنے۔ آج ہمارا لنچ کا پروگرام ہے۔" ایک آخری نظر خود پہ ڈالتا وہ نوفل کی جانب پلٹا۔

"کمال ہے۔ آپ غالباً" آج فیل ہوئے ہیں۔" اس نے طنزیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"سو واٹ.... گرتے ہیں شہ سوار ہی میدان جنگ میں۔" اس کے کندھے اچکانے پہ نوفل کے لب مسکرا دیے۔

"جی کیوں نہیں' لیکن کیا ہے نا کہ یہاں شہ سواروں کی بات ہو رہی ہے۔ ان نالائقوں کی نہیں جنہیں کبھی سواری پہ بیٹھنا ہی نہیں آیا۔"

"تیری تو....." احمر نے دانت پیستے ہوئے پاس پڑے برش کی طرف ہاتھ بڑھایا تو نوفل ہنستا ہوا جھپاک سے دروازہ کھول کے باہر نکل گیا۔

✡ ✡ ✡

"واؤ! کتنے خوب صورت ڈائیگرامز ہیں۔ یہ تمہاری ڈرائنگ تو نہیں ہے۔" نادیہ نے اس کے جرنل پہ سے نظریں اٹھاتے ہوئے اسے دیکھا تو وہ بڑے بھرپور انداز میں مسکرا دی۔

"نوفل بھائی نے بنائے ہیں۔" اس کی بات پہ اس کے برابر بیٹھی اسما نے جھٹ سے اپنی نوٹ بک سے سر اٹھایا۔

"لاؤ دکھاؤ۔" اسما کے ہاتھ بڑھانے پر نادیہ نے جرنل اسے تھما دیا۔

"زبردست!"

"یہ تمہارے نوفل بھائی تو ہرفن مولا ہیں یار۔" رجا کے تعریفی کلمات پہ طوبیٰ نے بے اختیار اسے گھورا۔

"ماشاء اللہ کہو۔ نظر لگاؤ گی کیا؟" اس کے آنکھیں نکالنے پہ نادیہ کے لبوں پہ شوخ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"بڑی فکر ہے بھئی۔" اس نے معنی خیزی سے طوبیٰ کو دیکھا۔" اسما اور رجا بھی شرارت سے اسے دیکھنے لگی تھیں۔ وہ بے اختیار سٹپٹا گئی۔

"بکو مت! بھائی ہیں وہ میرے۔"

"نہ۔ نہ۔ بھائی' صرف احمر بھائی ہیں۔ نوفل صاحب سے تمہارا ایسا کوئی رشتہ نہیں۔" نادیہ کے چڑانے پر رجا بھی میدان میں کود پڑی۔

"اور نہ کبھی بن سکتا ہے۔ ہاں اگر تم چاہو تو وہ تمہارے....."

"استغفار۔" طوبیٰ نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔

"ادھر دو مجھے۔" اس نے اپنا جرنل جھپٹا۔ "تم سب بہت بے ہودہ ہو گئی ہو۔"

"اس میں بے ہودگی کی کیا بات ہے۔ شادی تو سب ہی کی ہوتی ہے۔ تو کیوں نا اس مخلص سے یہ رشتہ جوڑا

جائے جو آپ کا خیال خود آپ سے بھی بڑھ کر رکھے۔" نادیہ کی بات پہ وہ ایک پل کو تھم سی گئی۔ واقعی شادی تو اسی سے ہونی چاہیے جو آپ کا خیال خود آپ سے بھی بڑھ کر رکھے.... لیکن اگلے ہی لمحے اس نے گھبرا کر اپنی اس سوچ کو جھٹک دیا۔

"وہ سب کا خیال اسی طرح رکھتے ہیں۔" وہ بولی تو اب کے آواز میں وہ تیزی نہ تھی۔

"ہو سکتا ہے۔ لیکن کسی غیر کے لیے اتنا ٹچی ہونا کہ اس کی کوئی بات نہ رد کر پانا۔ نارمل سے کچھ زیادہ ہے۔" خاموش بیٹھی اسما نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔ تو طوبیٰ ساکت نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ اسما نے ایک نظر اس کے ساکت چہرے پر ڈالی اور پھر بولی۔ "مجھے لگتا ہے وہ تمہیں پسند کرتے ہیں طوبیٰ۔" اور طوبیٰ کا دل ایک پل کو دھڑکنا بھول گیا۔

"لگتا نہیں۔ ایسا ہی ہے۔ میں نے تو یہ چیز بہت پہلے تمہاری باتوں سے محسوس کر لی تھی۔ پتا نہیں تمہیں آج تک کیوں محسوس نہیں ہوا۔" نادیہ نے اس کی طرف دیکھا تو وہ خالی خالی نظروں سے اس کا چہرہ تکنے لگی۔

"کیا واقعی وہ سب سچ کہہ رہی تھیں؟" بے یقینی سے سوچتے ہوئے اس نے اپنا نچلا لب دانتوں تلے دبا لیا تھا۔

ان تینوں کی باتوں نے اس پر سوچ کا ایک نیا در وا کر دیا تھا۔ وہ عجیب سی کشمکش کا شکار ہو گئی تھی۔ جس کے زیر اثر وہ اگلے دو دن صباحت آنٹی کی طرف نہیں جا سکی تھی۔ نتیجتاً تیسرے دن ضحیٰ خود ہی اس کے سر پر آ پہنچی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں کتابیں پھیلائے بے زار سی بیٹھی تھی، جب وہ دندناتی ہوئی اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔

"کہاں غائب ہو تم دو دن سے؟" کمر پہ ہاتھ رکھے اس نے طوبیٰ کو گھورا تھا۔

"میں نے کہاں جانا ہے۔ یہیں ہوں۔" اس نے پاؤں سمیٹے تو ضحیٰ اس کے مقابل بیٹھ گئی۔

"اگر یہیں ہو، تو ہماری طرف چکر کیوں نہیں لگایا؟" اس کے سوال پہ طوبیٰ بے اختیار گڑبڑا گئی۔

"وہ آج کل ہمارے ٹیسٹ ہو رہے ہیں۔ ان میں مصروف تھی۔" صد شکر کہ اس کے آگے کتابیں کھلی ہوئی تھیں۔ ورنہ ضحیٰ کو مطمئن کرنا مشکل ہو جاتا۔ وہ اور ضحیٰ میٹرک تک ایک ہی اسکول میں پڑھی تھیں۔ مگر کالج میں آنے کے بعد دونوں نے الگ الگ فیلڈ کا انتخاب کیا تھا۔ جس کے بعد انہیں علیحدہ کالجوں میں داخلہ لینا پڑا تھا۔ طوبیٰ ایف۔ ایس سی کی اسٹوڈنٹ تھی اور ضحیٰ نے کامرس لے رکھا تھا۔

"مجھے بھی یہی لگا تھا۔ مگر نوفل بھائی پریشان ہو رہے تھے۔" اس کی بات پہ طوبیٰ نے چونک کر ضحیٰ کی طرف دیکھا۔

"نوفل بھائی کیوں پریشان ہو رہے تھے؟" اس نے جھجکتے ہوئے سوال کیا۔ تو ضحیٰ مسکرا دی۔ وہ سمجھ رہے ہیں کہ تم محب بھائی کی وجہ سے ناراض ہو۔"

"ارے نہیں یار، ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔" وہ سرعت سے سیدھی ہوئی۔

"اگر ایسا نہیں ہے۔ تو پھر چلو ہماری طرف۔" ضحیٰ نے اس کا ہاتھ تھاما تو ناچار طوبیٰ کو اٹھنا پڑا۔

ضحیٰ کے ساتھ چلتی وہ ان کے لاؤنج میں داخل ہوئی تو کھانا کھاتے سب ہی افراد اس کی جانب متوجہ ہو گئے۔

"آہا! میری بیٹی آئی ہے۔" منصور صاحب کے شفقت بھرے اظہار پہ وہ مسکراتی ہوئی آگے بڑھی۔

"السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام..... آجاؤ بھئی فٹافٹ۔ تمہاری آنٹی نے بہت مزے دار بریانی بنائی ہے۔"

"میں کھانا کھا چکی ہوں انکل۔"

"کھا چکی ہو یا ناراض ہو ہم سے؟" سامنے بیٹھے نوفل جاہ نے اچانک گفتگو میں حصہ لیا۔ تو وہ جو اب تک اس کی طرف دیکھنے سے گریزاں تھی، پلکیں اٹھانے پر مجبور ہو گئی۔

"طوبیٰ ہم سے تو ناراض ہو سکتی ہے بھائی۔ مگر آپ سے کبھی نہیں۔" محب نے شرارت سے ایک نظر

اس پہ ڈالتے ہوئے بھائی کی طرف دیکھا۔ تو سب مسکرانے لگے۔

"کیوں طوبیٰ' محب ٹھیک کہہ رہا ہے؟" نوفل کے مسکرا کر استفسار کرنے پر طوبیٰ ناچاہتے ہوئے بھی جھینپ گئی۔

"جی نوفل بھائی۔" اس کے دھیرے سے جواب دینے پر سب ہی ہنس پڑے تھے۔

"چلو پھر اسی خوشی میں جاکر فریزر سے آئس کریم لے کر آؤ۔ میں نے تمہاری پسند کا فلیور منگوایا ہے۔" نوفل کی بات پہ طوبیٰ کے چہرے پہ خوش گوار سی حیرت پھیل گئی۔

"اور وہ بھی میری جیب سے۔" محب نے مردنی سے اضافہ کیا تو نوفل کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

"جو غلط کرے گا۔ سزا بھی اسے ہی ملے گی۔ اگر یہی زیادتی طوبیٰ کی طرف سے ہوتی' تو ایسی ہی کوئی سزا اسے بھی ملتی۔ کیوں طوبیٰ' ملتی نا؟" نوفل نے اس کی طرف دیکھا تو اس کے لبوں پہ کھیلتی مسکراہٹ یک لخت پھیکی پڑ گئی۔

"جی بالکل۔" وہ فقط اتنا ہی کہہ پائی تھی۔

"جاؤ تم آئس کریم نکالو۔ میں پیالیاں لے کر آتی ہوں۔" ضحیٰ نے اس کا شانہ تھپتھپایا تو طوبیٰ پلٹ کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔ فریزر کھول کے آئس کریم نکالتے ہوئے اسے اپنا چہرہ شرمندگی کے احساس سے جلتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ اپنی گزشتہ دو روز کی سوچوں پہ اسے ازحد ندامت محسوس ہو رہی تھی۔ نوفل جاہ تو سب کا ہی یکساں طور پہ خیال رکھنے کا عادی تھا۔ پھر بھلا اپنی سہیلیوں کی فضول باتوں میں آکر وہ اس کے احساس اور محبت کو کیوں غلط نظریے سے دیکھنے بیٹھ گئی تھی۔

"تمہیں کیا ہوا ہے؟" اسے لب بھینچے کھڑا دیکھ کر اندر آتی ضحیٰ چونک گئی تھی۔

"کچھ نہیں۔" وہ اک گہری سانس لیے باہر نکل گئی تھی' لیکن نجانے کیوں چند لمحے پیشتر کے برعکس اس کے دل پہ جیسے اوس سی گر گئی تھی۔

"کیا بات ہے' تم نے کافی دنوں سے اپنے نوفل بھائی کی کوئی بات شیئر نہیں کی؟" رجا نے چپس کھاتے ہوئے شوخ نظروں سے طوبیٰ کو دیکھا۔ وہ چاروں اس وقت کنٹین سے ملحقہ لان میں کھانے پینے کا سامان لیے بیٹھی تھیں۔ رجا کی بات پہ طوبیٰ نے ایک سنجیدہ سی نظر اس کے چہرے پر ڈالی تھی۔

"اس لیے کہ ان کی کوئی بھی بات اب میں تم لوگوں سے شیئر نہیں کرنا چاہتی۔"

"وجہ؟" رجا نے ابرو اچکائے۔

"وجہ یہ کہ تم لوگوں نے' نہ صرف میری باتوں کا غلط مطلب نکالا بلکہ مجھے بھی اسی تناظر میں سوچنے پر اکسایا جب کہ حقیقت میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ نوفل بھائی مجھ سے بالکل بھی ویسی محبت نہیں کرتے' جیسا تم لوگ کہتی ہو۔"

"اچھا! اور تم یہ بات اتنے یقین سے کیسے کہہ رہی ہو؟" نادیہ کی پیشانی پہ بل پڑ گئے تھے۔

"اس لیے کہ ان کا رویہ جیسا اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ ہے۔ ویسا ہی میرے ساتھ بھی ہے۔ انہوں نے کبھی ایسی کوئی غیر معمولی بات نہیں کی جسے میں کسی اور انداز میں لے سکوں۔" وہ قدرے غصے میں بولی تو نادیہ کے لبوں پہ استہزائیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"یہی تو سب سے زیادہ غیر معمولی بات ہے۔ اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ محبت سے پیش آنا ان کا فرض ہے جب کہ تم نہ تو ان کی بہن ہو اور نہ کزن۔ اور نہ ہی ان کی کوئی ہم عمر دوست۔ وہ تم سے اخلاقیات تو نبھا سکتے ہیں' لیکن تمہاری اتنی پروا کرنا کہ تمہاری کوئی بات رد نہ کر پانا۔ تمہاری چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھنا۔ تمہیں کبھی رونے نہ دینا۔ یہ سب معمول سے بہت زیادہ ہے۔ تمہارا اپنا بھائی بھی تو ہے۔ اس نے کبھی ضحیٰ کو اتنی اہمیت دی ہے کیا؟" اور طوبیٰ ایک لمحے کو کچھ بول نہیں سکی تھی۔

"مان لو طوبیٰ کہ وہ تمہیں پسند کرتے ہیں۔" اسے

چپ دیکھ کے نادیہ نے اپنی بات مکمل کی تو وہ بے اختیار جھنجھلا گئی۔

"اگر ایسی بات ہے تو انہوں نے کبھی کچھ کہا کیوں نہیں؟"

"تم خود تو کہتی ہو کہ وہ بہت ڈیسنٹ اور سمجھ دار انسان ہیں۔ پھر بھلا تم ان سے کسی سطحی حرکت کی امید کیسے کر سکتی ہو؟ ہو سکتا ہے وہ کسی مناسب وقت کا انتظار کر رہے ہوں۔" نادیہ کی بات پہ طوبیٰ سوچ میں پڑ گئی۔

"بالکل۔ مجھے بھی یہی لگتا ہے کہ وہ اپنی جاب لگنے اور اس کی پڑھائی ختم ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔" اسما نے نادیہ کی تائید کی تو بغور سنتی طوبیٰ نے بے قراری سے اپنا لب کاٹا۔

"اور اگر اس دوران کوئی اور آگیا تو؟" اور اگلے ہی لمحے ان تینوں کا بلند ہونے والا مشترکہ قہقہہ اسے اپنی غلطی کا احساس دلا گیا۔ آن واحد اس کا چہرہ کانوں کی لوؤں تک سرخ ہو گیا تھا۔

"اچھا جی۔ تو تمہیں بھی ان کے علاوہ کوئی اور قبول نہیں۔" رجا نے اسے ٹھوکا دیا۔ طوبیٰ کے لبوں پہ شرمیلی سی مسکان آٹھہری۔

"ظاہر سی بات ہے۔ اگر ایسا ہے تو مجھے بھی ان سے بڑھ کر بھلا اور کون ہو سکتا ہے۔" اور ان سب کی معنی خیز "او" نے اسے جھینپ کر ہنسنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس گفتگو نے طوبیٰ کے اندر سے ہر ابہام مٹا دیا تھا۔ یہ احساس کہ نوفل جاہ اسے چاہتا ہے۔ اس کے اندر پھول ہی پھول کھلا گیا تھا۔ وہ عمر کے جس حصے میں تھی، وہاں ویسے بھی آنکھوں کو خواب سجانے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔ نوفل کو چپکے چپکے سوچنا، اس کے تصور سے باتیں کرنا طوبیٰ کو اچھا لگنے لگا تھا۔ اسے پتا بھی نہیں چلا تھا اور محبت کی خوش رنگ تتلی نے اس کے معصوم دل پہ نوفل جاہ کی محبت کے بڑے گہرے رنگ بکھیر دیے تھے۔

☆ ☆ ☆
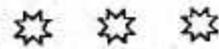
دن کچھ اور آگے بڑھے تھے، جب ایک روز اچانک جاہ پیلس کے مکینوں پہ ایک خبر قیامت بن کے ٹوٹی تھی۔

"کیا؟" صباحت بیگم نے دہل کے اپنے سینے پہ ہاتھ رکھا تھا۔ ان کی آنکھیں بے یقینی کے عالم میں شوہر کے چہرے پر جمی تھیں۔ جو بہت مضمحل سے صوفے پہ بیٹھے تھے۔ نوفل، محب اور ضحیٰ بھی سناٹے کی سی کیفیت میں گھرے، باپ کو دیکھ رہے تھے۔

"آپ نے یہ بات ہمیں پہلے کیوں نہیں بتائی؟" نوفل اٹھ کے ان کے قریب آبیٹھا۔

"اس لیے کہ مجھے یقین تھا کہ میرا نام اس معاملے سے نکل جائے گا، لیکن فنڈز میں یہ گھپلا بہت بڑے پیمانے پہ کیا گیا ہے۔ جن کی پشت پہ بڑے بڑے ہاتھ تھے، وہ تو مکھن میں سے بال کی طرح نکل گئے ہیں اور جو آفیسرز میری طرح لینے دینے کے قائل نہیں، ان کے سر سارا گند منڈھ دیا گیا ہے۔ میں تم لوگوں کو یہ بات ابھی بھی نہیں بتاتا اگر جو صورت حال اتنی بگڑ نہ جاتی۔" دل گرفتگی سے کہتے ہوئے انہوں نے سب کی طرف دیکھا تو نوفل نے بے اختیار ان کا ہاتھ تھام لیا۔ "میرے خلاف انکوائری شروع کروا کے مجھے سسپینڈ کر دیا گیا ہے۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ دھیرے سے بولے تو صباحت بیگم پھپھک کے رو پڑیں۔ منصور جاہ نے ایک نظر ان پہ ڈالی اور اک بوجھل سانس کھینچی۔

"میرا اللہ گواہ ہے کہ میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا۔ میں نے تم لوگوں کے منہ میں کبھی حرام کا ایک لقمہ نہیں جانے دیا، مگر آج میں بہت بے بس ہوں، میرے پاس اپنی سچائی اور ایمان داری کو ثابت کرنے کے لیے کوئی ثبوت نہیں۔" ان کی آواز بے اختیار رندھ گئی تھی اور ان سب کو لگا تھا جیسے ان کے دل کسی نے مٹھی میں لے کر نچوڑ دیے ہوں۔

"پلیز بابا آپ کیوں ہمیں اپنی صفائی دے رہے ہیں؟" نوفل نے تڑپ کے ان کی طرف دیکھا۔ "کیا ہم نہیں جانتے کہ ہمارے ماں باپ کس کردار کے مالک ہیں؟ آپ دیکھیے گا، اللہ تعالیٰ آپ کی سچائی کیسے

سب پہ واضح کرے گا۔ آپ بس حوصلے سے کام لیں۔
ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔" اس نے ان کا ہاتھ
اپنے لبوں سے لگایا تو منصور صاحب نے آگے بڑھ کے
اس کا سر چوم لیا۔ محب بھی باپ کے دوسری طرف آ
بیٹھا تھا۔ جب کہ ضحیٰ نے روتی ہوئی صباحت بیگم کو
اپنے بازوؤں کے گھیرے میں لے لیا تھا۔

"ان شاء اللہ۔ تم سب میرے ساتھ ہو، مجھے بھلا
اور کیا چاہیے۔" انہوں نے مسکرا کر محب کو اپنے
ساتھ لگایا تو صباحت نے بھی اک گہری سانس کھینچتے
ہوئے اپنے آنسو دوپٹے سے پونچھ ڈالے۔

☆ ☆ ☆

غبن کے الزام میں منصور جاہ کی معطلی اور ان کے
خلاف شروع ہونے والی کارروائی کی یہ خبر جنگل کی
آگ کی طرح پھیلی تھی۔ ارجمند بیگم، احمر، طوبیٰ سب
ہی اس کڑے وقت میں ان سب کے ساتھ برابر کے
شریک تھے، مگر حسن مجتبیٰ کو نئی فکروں نے آن گھیرا
تھا۔ انہوں نے اگلے ہی دن اپنی کمپنی کے اہم اراکین
سے مشاورت کی تھی اور منصور جاہ کو آفس بلوا لیا تھا۔
جہاں کسی کی بھی موجودگی کی پروا کیے بغیر وہ سیدھا
مدعے پہ آئے تھے۔

"دیکھو منصور، میں جانتا ہوں کہ تم پہ لگا الزام غلط
ہے اور اللہ نے چاہا تو جلد یا بدیر تم اس سے بری بھی
ہو جاؤ گے، مگر فی الحال تمہارے خلاف جو کارروائی
شروع کی گئی ہے۔ اس میں تمہارے تمام اثاثوں کی
چھان بین کی جائے گی۔ اس سلسلے میں تم سے جڑے
ہر نام کو رگیدا جائے گا اور میں نہیں چاہتا کہ میری کمپنی
کی ساکھ کو کوئی نقصان پہنچے یا میرا نام بدنام ہو۔ اس
لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہاری بنیادی انویسٹ
منٹ تمہیں لوٹا کے میں تم سے الگ ہو جاؤں۔" ان
نگاہیں جمائے وہ سرد و سپاٹ لہجے میں بولے تو مقابل
بیٹھے منصور جاہ کے چہرے پر زلزلے کی سی کیفیت در
آئی۔ یہ کمپنی کب "تمہاری" سے صرف حسن مجتبیٰ کی
بن گئی تھی، انہیں پتا نہیں چلا تھا۔ مگر وہ انہیں اپنی کوئی
پچھلی نیکی جتا کر یا حالیہ مجبوری گنوا کر، اپنا بھرم نہیں
کھونا چاہتے تھے، کیونکہ جو شخص آپ کی آنکھوں سے
آپ کی ضرورت کو نہ سمجھ سکے اس کے آگے اپنے
الفاظ بھی ضائع نہیں کرنے چاہئیں۔ سو انہوں نے
بھی اپنی لب سختی سے بھینچ لیے تھے۔ ہاں لیکن وہ
چہرے کی رنگت کو متغیر ہونے سے روک نہیں سکے
تھے۔

"میں نے وکیل صاحب سے بات کر لی ہے۔ وہ جلد
ہی کاغذی کارروائی بھی مکمل کر لیں گے۔" حسن مجتبیٰ
نے بنا کسی پس و پیش کے اپنی بات جاری رکھی تھی۔
ان کی تو ویسے بھی دلی مراد بر آئی تھی۔ بیٹھے بٹھائے نا
صرف منصور جاہ سے جان چھوٹ گئی تھی۔ بلکہ ان پہ
کوئی بات بھی نہیں آئی تھی۔

"اور کچھ؟" اتنی دیر میں یہ واحد الفاظ تھے۔ جو ان
کی زبان سے ادا ہوئے تھے۔ ان کی یہ کیفیت اور کسی کو
نہ سہی لیکن منیجر صاحب کو بہت شدت سے محسوس
ہوئی تھی۔ وہ آج سے نہیں بلکہ شروع سے اس کمپنی
کے ساتھ منسلک تھے۔ انہیں حسن مجتبیٰ کا اپنے
دوست کو یوں بیچ منجدھار میں چھوڑ دینا، بہت تکلیف
پہنچا رہا تھا۔ مگر وہ اپنی جگہ بے بس تھے۔

"نہیں۔" حسن صاحب کے جواب پہ منصور جاہ
اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک
نظر اپنے اردگرد موجود لوگوں پہ ڈالی تھی۔ اور اپنے
دوست کی طرف دیکھا تھا۔

"بہت شکریہ!" ان کا لہجہ ان کی نظروں کی طرح ہر
گلے سے عاری تھا۔ مگر نجانے کیوں حسن مجتبیٰ ایک
پل سے زیادہ ان کی آنکھوں میں نہیں دیکھ سکے تھے۔
ان کا نگاہیں چرانا منصور جاہ کے لبوں پہ اک تلخ
مسکراہٹ بکھیر گیا تھا۔ انہوں نے میز پر رکھی اپنی
گاڑی کی چابی اٹھائی تھی۔ اور مضبوط قدموں سے چلتے
ہوئے دہلیز پار کر گئے تھے۔ ان کے جانے کے کتنی ہی
دیر تک کوئی کچھ بھی کہنے کے قابل نہیں رہا تھا۔
منصور جاہ کی خاموشی نے ان سب کو گونگا کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

صباحت ظہر کی نماز پڑھ کے فارغ ہوئی تھیں۔ جب منصور صاحب نے لاؤنج میں قدم رکھا تھا۔

"السلام علیکم۔" وہ مسکرا کے آگے بڑھی تھیں مگر جوں ہی ان کی نظران کے چہرے سے ٹکرائی تھی وہ ٹھٹک کر رک گئی تھیں۔

"کیا بات ہے آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"ہاں۔" وہ دھیرے سے کہتے صوفے پہ بیٹھ گئے تھے۔ "ایک گلاس پانی تو پلانا۔" صباحت تیز قدموں سے کچن کی طرف بڑھ گئی تھیں۔ وہ پانی لے کر آئیں تو منصور صاحب صوفے کی پشت سے سر ٹکائے نجانے کن سوچوں میں گم تھے۔

"پانی پی لیں۔" ان کے متوجہ کرنے پہ وہ اک گہری سانس لیتے سیدھے ہو بیٹھے تھے۔ انہیں پانی کا گلاس تھما کر وہ ان کے پاس بیٹھ گئی تھیں۔

"کیا بات ہے۔ اتنے پریشان کیوں لگ رہے ہیں آپ؟"

"میں نے سنا ضرور تھا صباحت کہ مشکل وقت میں سایہ بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔ مگر اس تلخ حقیقت کو جھیلنے کا تجربہ مجھے آج پہلی بار ہوا ہے۔" وہ بولے تو ان کے لہجے میں درد ہی درد تھا۔ صباحت کو لگا جیسے ان کا دل کسی نے مسل کر رکھ دیا ہو۔

"آپ کہاں گئے تھے؟" انہوں نے بے اختیار ان کا بازو چھوا۔

"میں....." وہ اپنے دھیان میں بولتے یک لخت تھم سے گئے۔ "بتاؤں گا۔ فی الحال میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"کھانا تو کھالیں۔" صباحت نے پریشانی سے ان کی طرف دیکھا۔

"ابھی نہیں۔" وہ دھیرے سے کہتے سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئے تو ان کی پشت پہ نگاہیں جمائے بیٹھی صباحت بیگم کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اپنے شریک حیات کے وجود سے چھلکتی شکستگی کو برداشت کرنا ان کے بس سے باہر تھا۔ وہ اپنا سر تھامے بے اختیار سسک اٹھی تھیں۔

☆ ☆ ☆

اس دوپہر منصور جاہ سوئے تھے۔ اور سوتے ہی رہ گئے تھے۔ دل کا پہلا ہی دورہ جان لیوا ثابت ہوا تھا۔ وہ کہاں گئے تھے؟ کہاں سے واپس آئے تھے؟ کوئی کچھ نہیں جانتا تھا۔ اور جو جانتا تھا وہ خاموشی کی چادر اوڑھے چپ کا چپ رہ گیا تھا۔ اپنی غلطی کا احساس کچھ گھنٹوں کے لیے جاگا ضرور تھا۔ مگر پھر اس احساس پہ مشیت ایزدی کا پردہ ڈال کے وہ مطمئن ہو گئے تھے۔ ذاتی کمزوریوں اور کوتاہیوں کے نتیجے میں ہونے والے نقصان کو اوپر والے سے منسوب کر دینا ویسے بھی انسان کے لیے سب سے آسان ہوتا آیا ہے۔ سو حسن مجتبیٰ نے بھی یہی کیا تھا۔

لیکن منصور صاحب کی اچانک موت نے ان کے اہل خانہ کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ سب سے برا حال نوفل کا تھا۔ وہ زندگی کے تھپیڑے کھانے کو بالکل تنہا رہ گیا تھا۔ لیکن اسے اف تک کرنے کی اجازت نہ تھی۔ کیونکہ وہ ایک مرد تھا۔ گھر کا بڑا بیٹا تھا۔ جو راتوں رات اپنے خاندان کا کفیل بن گیا تھا۔ اس ذمہ داری نے اسے دنوں میں گھلا دیا تھا۔ اپنی پارٹ ٹائم جاب کے علاوہ اس کے پاس آمدنی کا واحد ذریعہ منصور صاحب کی حسن مجتبیٰ کے ساتھ کی گئی انویسٹمنٹ تھی۔

منصور جاہ کی فوتگی کے پندرھویں روز حسن مجتبیٰ نے رات میں نوفل کو بلا بھیجا تھا۔ اور وہ جو ابھی کچھ دیر پیشتر سینٹر سے لوٹا تھا' بنا کچھ کھائے پیئے "حسن ولا" چلا آیا تھا۔ جہاں اس کا پہلا سامنا' لاؤنج میں بیٹھی طوبیٰ سے ہوا تھا۔ طوبیٰ کا دل اسے اچانک سامنے پا کے کھل اٹھا تھا۔

"السلام علیکم نوفل بھائی۔" وہ بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھی تھی۔ نوفل کو دیکھنے کا اتفاق اسے آج تین' چار دن بعد ہوا تھا۔ طوبیٰ کو وہ پہلے کی نسبت کمزور اور مرجھایا ہوا لگا تھا۔ حلیہ بھی خاصا رف ہو رہا تھا۔ اس کا دل نوفل جاہ کے لیے دکھ سے بھر گیا تھا۔

"وعلیکم السلام۔ انکل کہاں ہیں؟" اس نے طوبیٰ کی

طرف دیکھا۔

"اسٹڈی میں۔" اس کے جواب پہ وہ سرہلا تا اندر کی طرف بڑھا تھا کہ معاً" طوبیٰ کو ایک خیال نے آن گھیرا تھا۔

"نوفل بھائی!" اس کے پکارنے پہ آگے جاتے نوفل نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا تو وہ ایک قدم آگے بڑھ آئی۔

"آپ نے کھانا کھایا ہے؟"

"ابھی نہیں۔" وہ نفی میں جواب دیتا آگے چل دیا تو طوبیٰ تیزی سے کچن میں چلی آئی۔ آج اس نے خود اپنے ہاتھوں سے بہت مزے دار پاستا بنایا تھا۔ پاستا نکالتے ہوئے اس کا دھیان فریزر میں موجود شامی کبابوں اور مچھلی کی طرف گیا تو وہ ہاتھ روک کر فریج کی طرف چلی آئی۔ نوفل کے لیے کچھ کرنے کے احساس نے اس کے اندر پھرتی سی بھر دی تھی۔ وہ بڑے مگن انداز میں اس کے لیے ٹیبل سجانے کی تگ و دو میں لگ گئی تھی۔

نوفل قدم اٹھاتا' اسٹڈی میں چلا آیا تھا۔ جہاں حسن مجتبیٰ پہلے سے اس کے منتظر تھے۔ سلام دعا کے بعد انہوں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ خاموشی سے ان کے مقابل بیٹھ گیا۔

"ایسا ہے نوفل بیٹا کہ آج سے تقریباً" ڈیڑھ دو ماہ پہلے، منصور نے مجھ سے اپنی بنیادی انویسٹ منٹ کی واپسی کا تقاضا کر دیا تھا۔ وہ اس پاٹنر شپ کو ختم کرنا چاہتا تھا۔" انہوں نے گلا کھنکارتے ہوئے بات شروع کی تو نوفل شاکڈ سا ان کا چہرہ تکنے لگا۔

"کیا؟" اس کی آنکھیں مارے بے یقینی کے پھیل گئی تھیں۔

"ہاں۔ میں نے تب اسے کافی سمجھایا تھا۔ یہ بھی بتایا تھا کہ بزنس میں سے ایک ساتھ اتنی بڑی رقم نکالنا میرے لیے ممکن نہیں۔ مگر اس نے میری بات ہی نہیں سنی۔ کہنے لگا کہ دبئی میں سرمایہ کاری کا کوئی موقع مل رہا ہے اور وہ یہ رقم وہاں لگانا چاہتا ہے۔"

"دبئی میں؟" نوفل پریشان سا بڑبڑایا۔ "دبئی میں بھلا کون ہے ہمارا؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں بیٹا۔" حسن مجتبیٰ کے لہجے میں اتری سادگی سننے سے تعلق رکھتی تھی۔ نوفل نے بے اختیار اپنا سر پکڑ لیا۔

"اب ایسا ہے کہ......"

"پلیز انکل!" اس نے تیزی سے سر اٹھاتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔ "میں نہیں جانتا بابا کا کیا ارادہ تھا۔ لہٰذا میں اس پاٹنر شپ کو ختم نہیں کرنا چاہتا۔" اس کی بات پہ حسن مجتبیٰ نے ایک گہری سانس لی۔

"اب ایسا ممکن نہیں ہو سکتا نوفل۔ منصور علیحدگی کے کاغذات سائن کر چکا تھا۔ اب تو صرف رقم کا ٹرانسفر رہتا ہے۔ کیونکہ میں نے اس سے ڈیڑھ ماہ کی مہلت مانگی تھی۔" اور نوفل کو لگا جیسے اس کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی ہو۔ وہ پتھرایا ہوا حسن صاحب کو میز پہ پڑی فائل اٹھائے ہوئے دیکھنے لگا۔ جو انہوں نے کھول کر اس کی طرف بڑھا دی۔

"تو تم خود دیکھ لو۔" ناچار نوفل کو فائل تھامنی پڑی تھی۔ نچلا لب دانتوں تلے دبائے اس نے ہاتھ میں پکڑے کاغذات کی طرف دیکھا تھا جو تقریباً" پونے دو ماہ پہلے لکھے گئے تھے۔ جوں جوں اس کی نظریں سطروں پہ پھسلتی گئی تھیں اس کی رنگت فق ہوتی چلی گئی تھی اور آخر میں اپنے بابا کے دستخط پر آ کر اس کی دھڑکن رک گئی تھی۔ سب ختم ہو گیا تھا۔ ان کی آمدنی کا واحد دریا بابا نے اپنے ہاتھوں بند کر دیا تھا۔ کوشش کے باوجود وہ اپنی پلکوں کو بھیگنے سے روک نہیں پایا تھا۔

"آئی ایم سوری بیٹا کہ مجھے اس کڑے وقت میں تمہیں اس حقیقت سے آگاہ کرنا پڑا ہے۔" انہوں نے اٹھ کر اس کا شانہ تھپتھپایا۔ نوفل کا چہرہ مارے ضبط کے سرخ ہو گیا۔ اس نے اپنی مٹھی سختی سے لبوں پر جما دی۔ اور نظریں جھکالیں۔

"مگر بے فکر رہو۔ میں ہر ہر لمحہ تم لوگوں کے ساتھ رہوں گا۔ تم لوگ میرے اپنے بچے ہو بیٹا۔" انہوں نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا۔ "میں جانتا ہوں کہ منصور کی ہر چیز کی چھان بین چل رہی ہے۔ اس لیے میں نے

رقم اس کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروانے کے بجائے تمہارے نام پہ چیک کاٹ دیا ہے۔" انہوں نے جیب میں رکھا چیک نکال کر اس کی طرف بڑھایا تو نوفل کی نظریں ان کے ہاتھ میں تھمے چیک پر جا ٹھہریں۔ "تم جب دل چاہے اسے کیش کروالینا۔"

ان کی بات پہ اس کا دل احساس ممنوعیت سے بھر گیا۔ کتنا خیال تھا انہیں ان سب کا۔ اپنی آنکھوں میں چمکتے آنسو حلق میں اتارتے ہوئے وہ دھیرے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"شکریہ انکل۔" اس نے فائل کے ساتھ چیک بھی تھام لیا۔ حسن مجتبیٰ نے اسے خود سے لگالیا۔

"اللہ پاک تمہاری ہر مشکل آسان کرے بیٹا۔" انہوں نے اس کی پیٹھ تھپتھپائی۔ نوفل کے لبوں پہ ایک زخم خوردہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"آمین۔" ان سے ہاتھ ملا کر وہ تیز قدموں سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اسٹڈی کا دروازہ کھلنے کی آواز پہ لاؤنج میں منتظر بیٹھی طوبیٰ اٹھ کر کچن کی طرف بھاگی تھی۔ اور پہلے سے سجی ہوئی ٹرے اٹھا کر باہر چلی آئی تھی۔ جوں ہی نوفل راہداری عبور کر کے لاؤنج میں داخل ہوا تھا۔ وہ بے اختیار اس کی طرف بڑھی تھی۔

"نوفل بھائی کھا......" اس کا جملہ منہ میں ہی رہ گیا تھا۔ نوفل اس کے پاس سے گزرتا آگے چلا گیا تھا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے دروازہ پار کر گیا تھا۔

ٹرے اٹھائے کھڑی طوبیٰ اپنی جگہ پہ ساکت رہ گئی تھی۔ نوفل جاہ اور اس کی پکار کو نظرانداز کر جائے۔ ایسا بھلا پہلے کب ہوا تھا؟ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئی تھیں۔ اور اندر اپنی اسٹڈی میں موجود حسن مجتبیٰ کے لبوں پر جان دار سی فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

"خس کم جہاں پاک!" اپنے ہاتھ جھاڑتے ہوئے وہ پرسکون سے ٹانگ پہ ٹانگ جما کے بیٹھ گئے تھے۔

☆ ☆ ☆

لمبے لمبے ڈگ بھرتا نوفل جوں ہی اپنے لاؤنج میں داخل ہوا تھا۔ اس کے انتظار میں بیٹھی صباحت نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پہ نگاہ پڑتے ہی وہ بری طرح چونک گئی تھیں۔

"کیا ہوا ہے بیٹا؟ سب ٹھیک تو ہے نا؟" ماں کے استفسار پہ محب نے بھی بھائی کی طرف دیکھا تھا۔ مگر نوفل بنا کوئی جواب دیے تیز قدموں سے سیڑھیاں چڑھ گیا تھا۔

"انہیں کیا ہوا ہے؟" محب نے حیرانی سے صباحت بیگم کو دیکھا جو خود بھی پریشان سی اسے دیکھ رہی تھیں۔ اگلے ہی لمحے وہ اٹھ کر زینے کی طرف بڑھ گئی تھیں۔ فکر مند سا محب بھی ماں کے پیچھے چل دیا تھا۔

نوفل کے کمرے کے باہر پہنچ کر صباحت نے دروازے پہ دستک دی تھی۔ اور جواب کا انتظار کیے بغیر اندر داخل ہوگئی تھیں۔ لیکن کمرے میں قدم رکھتے ہی انہیں دھچکا سا لگا تھا۔ نوفل دونوں ہاتھوں میں سر گرائے بیڈ پہ بیٹھا ہوا تھا۔ صباحت ہول کر آگے بڑھی تھیں۔

"نوفل کیا ہوا ہے بیٹا؟" ان کی آواز پہ پیچھے آتا محب گھبرا کے کمرے کی طرف بھاگا تھا۔ جوں ہی وہ اندر داخل ہوا تھا۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ نوفل کا چہرہ سرخ اور آنسوؤں سے تر تھا۔

"سب ختم ہوگیا امی۔ بابا اپنے ہاتھوں سے حسن انکل کے ساتھ پاٹنرشپ ختم کر گئے ہیں۔"

"کیا!" صباحت بیگم کی رنگت فق ہوگئی تھی۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ منصور اتنا بڑا قدم ہمارے علم میں لائے بغیر نہیں اٹھا سکتے۔" انہوں نے بے یقینی سے نفی میں سر ہلایا۔

"مجھے بھی ایسا ہی لگا تھا۔ مگر دو مہینے پہلے بننے والی ان دستاویزات پہ بابا کے سائن ہیں۔ انہوں نے سب کچھ اپنی زندگی میں خود طے کیا تھا۔" اس نے پاس پڑی فائل اٹھا کے ماں کے سامنے کی تو صباحت نے تیزی سے فائل پکڑ کے کھولی۔ ان کی بے چین نظریں تحریر کے بجائے اپنے شوہر کے دستخط کی تلاش میں تھیں۔ اور انہیں وہاں پا کے ان کی سانس رک گئی تھی۔

انہیں بت بنا دیکھ کے محب نے بے قراری سے فائل ان کے ہاتھ سے لے لی تھی۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بابا ہمارے ساتھ اتنا غیروں جیسا سلوک بھی کر سکتے ہیں۔ مجھے تو ان کی بے اعتباری نے توڑ کے رکھ دیا ہے۔" نوفل کے لہجے میں ٹوٹے کانچ سا دکھ بول رہا تھا۔ دل کہہ رہا تھا کہ ان کا اتنا چاہنے والا باپ انہیں اتنی بڑی ٹھیس کبھی نہیں پہنچا سکتا۔ مگر آنکھوں کے سامنے بکھری سچائی دل کی ہر بات کو جھٹلانے پر تلی تھی۔ اس کا اپنے بابا پر مان آج بکھر گیا تھا۔

"یہ آپ نے کیا کر دیا منصور؟" صباحت بے اختیار سسک اٹھی تھیں۔ ان کی ہر ہر سسکی نوفل جاہ کے اندر ضرب لگا رہی تھی۔ اتنی کاری کہ اس کے لیے ان کے وار کو سہنا مشکل ہو گیا تھا۔ اگلے ہی پل وہ ایک جھٹکے سے اٹھا تھا اور تیز قدموں سے باہر نکل گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

طوبیٰ کالج سے لوٹی تو گھر میں عجیب سی خاموشی تھی۔ وہ بیگ رکھ کے بنا یونیفارم تبدیل کیے اماں جان کی تلاش میں کچن سے ہوتی ان کے کمرے میں چلی آئی تھی۔

"السلام علیکم۔" انہیں الماری کے آگے کھڑا دیکھ کے وہ اندر آگئی تھی۔

"وعلیکم السلام۔" ارجمند بیٹی کی طرف پلٹیں۔ تو ان کا ستا ہوا چہرہ دیکھ کے طوبیٰ ایک لخت پریشان ہو گئی۔

"آپ روئی ہیں؟" وہ تیزی سے ان کے قریب آئی تھی اور ارجمند خود پہ ضبط کھو بیٹھی تھیں۔

"اماں جان کیا ہوا ہے؟" طوبیٰ نے گھبرا کر ان کے ہاتھ تھامے۔

"تمہارے پاپا نے منصور بھائی کے ساتھ پاٹنر شپ ختم کر دی ہے۔" وہ آنسوؤں کے درمیان بولیں۔

"کیا؟" طوبیٰ بھونچکی رہ گئی۔ "آپ کو کس نے بتایا؟"

"بھابھی نے۔ میں آج صبح ان کی طرف گئی تو مارے غم کے نڈھال پڑی تھیں وہ۔" ماں کی بات پہ طوبیٰ نے اپنا نچلا لب دانتوں تلے دبا لیا۔ ذہن میں بے اختیار کل رات کا منظر گھوم گیا جب نوفل اسے دیکھے بغیر باہر نکل گیا تھا۔ اس وقت وہ پتا نہیں کتنا پریشان تھا۔ اور وہ... اسے اپنی بدگمانی پہ شدید غصہ آیا تھا۔

"آپ نے پاپا سے پوچھا نہیں کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ ان لوگوں کو ہمارے کو ہمارے ساتھ کی کتنی ضرورت ہے۔ ایسے حالات میں پاپا نوفل بھائی کے ساتھ اتنی بڑی زیادتی کیسے کر سکتے ہیں؟" طوبیٰ کے لہجے میں گلہ ہی گلہ تھا۔ باپ کے اس عمل پر اسے بہت شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ان سب کا سامنا کیسے کرنے والی تھی۔

"وہ آتے ہیں تو بات کرتی ہوں۔" ارجمند بیگم نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے اک گہری سانس لی تھی

گوکہ انہیں صباحت بیگم بتا چکی تھیں کہ یہ علیحدگی منصور جاہ کی خواہش پہ ان کی زندگی میں ہی طے پا گئی تھی۔ مگر پھر بھی گزرے تجربے کی روشنی میں ارجمند بیگم کا دل اس بات پہ یقین کرنے سے انکاری تھا۔

اور جب انہوں نے تنہائی میں اپنے اس خدشے کا اظہار حسن صاحب سے کیا تھا تو وہ بری طرح ان پہ برس پڑے تھے۔

"تمہارا دماغ خراب ہے کیا؟ تم نے کیا مجھے اتنا بے ضمیر انسان سمجھا ہوا ہے کہ میں اپنے مرے ہوئے دوست پہ اتنی بڑی تہمت لگاؤں گا۔ اس کے نام پہ جھوٹے کاغذات بناؤں گا؟"

"میں نے یہ کب کہا حسن۔ میں تو صرف یہ کہہ رہی ہوں کہ کہیں آپ نے تو اس علیحدگی کے لیے منصور بھائی سے تو نہیں کہا تھا؟" ارجمند بیگم نے گھبرا کے اپنی صفائی دی۔

"مجھے کیا ضرورت پڑی تھی اس سے ایسا کچھ کہنے کی۔ حسن مجتبیٰ نے نگاہیں چرائیں۔ "ہاں میرا ارادہ ضرور تھا علیحدگی کا۔ لیکن اسے اب اتفاق کہو یا کچھ اور کہ منصور نے خود ہی اپنے سرمائے کا تقاضا کر دیا۔" وہ قدرے دھیمے لہجے میں بولے تو ارجمند بیگم نے ایک گہری سانس لی۔ کم از کم انہیں اتنا اطمینان تو ہوا تھا کہ اس سب میں ان کے شوہر کا کوئی عمل دخل نہ تھا۔

"آپ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ نوفل کے ساتھ اس پارٹنر شپ کو دوبارہ کر لیں۔"

"یہ بزنس ہے کوئی بچوں کا کھیل نہیں ارجمند بیگم۔ ویسے بھی میں دوبارہ کسی پارٹنر شپ میں نہیں پھنسنا چاہتا۔"

"لیکن......"

"تم پلیز اپنے کام سے کام رکھو۔ نوفل کوئی بچہ نہیں ہے۔ اسے اپنی ذمہ داریاں سنبھالنے دو۔" وہ قطعیت سے کہتے باہر نکل گئے تھے۔ اور ارجمند بیگم ملول سی بیٹھی رہ گئی تھیں۔ مگر انہوں نے اس علیحدگی کی اصل وجہ یعنی منصور صاحب کی ذاتی خواہش سے اپنے بچوں کو ضرور آگاہ کر دیا تھا۔ ایک اچھی ماں ہونے کے ناطے وہ اپنا فرض سمجھتی تھیں کہ اپنی اولاد کے دل میں ان کے باپ کے خلاف کسی غلط فہمی کو پنپنے نہ دیں۔

☼ ☼ ☼

"کیا؟" نوفل نے حیرت سے اپنے سامنے بیٹھے احمر حسن کی طرف دیکھا۔

"اس میں اتنا چونکنے کی کیا بات ہے۔ چیک کیش کرواؤ اور میرے ساتھ چلو۔ میں وہاں پڑھوں گا اور تم اپنے اس پیسے سے کوئی کاروبار شروع کر لینا۔" احمر کے مشورے پہ نوفل ایک پل کو پلکیں جھپکنا بھول گیا۔۔۔ کیا واقعی باہر کی دنیا ہر مشکل سے نجات کا ذریعہ ہے؟ اس نے خود سے سوال کرتے ہوئے احمر حسن کی طرف دیکھا تھا۔ جو اس کے سامنے بیٹھا اس کی ہاں یا نہ کا منتظر تھا۔

"میرے لیے فکر معاش سے زیادہ اپنی ماں اور اپنے بہن بھائی کو دنیا کے سرد و گرم سے بچانا ہے۔ میں انہیں یہاں تنہا چھوڑ کے نہیں جا سکتا۔ اللہ نے میرے لیے رزق کی جو راہیں کھولنی ہوں گی وہ یہاں بھی کھول دے گا۔" اس نے رسان سے جواب دیا۔ تو احمر کے چہرے پر ناگواری کی سرخی چھا گئی۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔ بیٹھو یہاں اور دھکے کھاؤ۔ تم جیسے جذباتی اور بے وقوف لوگوں کے لیے ترقی ویسے بھی اپنے دروازے نہیں کھولتی۔" تلخی سے کہتا وہ اٹھ کر باہر نکل گیا تھا۔

اور پیچھے نوفل لب بھینچے اس کے لفظوں کی کڑواہٹ کو اپنے اندر اتارنے کے لیے تنہا رہ گیا تھا۔ اگر ترقی کی قیمت بے حسی اور خود غرضی تھی تو اسے اپنوں کے درمیان ایک ناکام انسان بن کر رہنا ہزار بار قبول تھا۔ اور یہی نوفل جاہ کا پہلا اور آخری فیصلہ تھا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

☼ ☼